اِحتساب

(انور شیخ کی غزل کا تنقیدی و تقابلی مطالعہ)

انور شیخ

عشرت ظفر

احتساب

عشرت ظفر

نہیں کرنا چاہئے کہ ہمارے ادبی معاشرے میں کچھ لوگ فن کا لبادہ اوڑھ کر اس میں اسلئے پناہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ زندگی کے اہم ترین فرائض کی ادائیگی سے بچ جائیں خواہ معاشرہ انہیں جس قدر بھی لعن طعن کرے مگر وہ زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ نہیں ملا پاتے خود پر ایک طرح کی مصنوعی تخلیق فن کی کیفیت طاری رکھتے ہیں لیکن ان میں ممتاز اور عظیم وہی ہوتے ہیں جو حقائق شناس ہیں، جہد للبقا کے میدان کے شہسوار ہیں، وہ شعلوں سے بھی کھیلتے ہیں، دامن بھی بچا لے جاتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ زندگی کے حسن برق وش کے دل سوختہ بھی وہی ہوتے ہیں۔ انہیں میں ایک انور شیخ بھی ہیں جنہوں نے اعلیٰ سماجی زندگی کی تشکیل بھی کی اور ادبی میدانوں میں بھی اپنے رخش فکر و قلم کو مہمیز کرتے رہے۔ دراصل یہی معراج حیات ہے۔

انور شیخ نے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں وہ علوم بھی حاصل کئے جن سے جاوداں انسانی اقدار کی تراوش ہوتی ہے اور وہ بھی جو ہماری زندگی کو معاشی طور پر پرسکون بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔ دراصل ثروت مند و ہنر مند وہی ہے جو جسم و روح دونوں کو زرخیز بنائے کیونکہ دونوں مل کر ایک نیا امتزاج پیدا کرتے ہیں، ایک توازن وجود میں آتا ہے اور جب زندگی نشاط و غم کے میزان میں تلتی ہے تو پھر اس ساز کی لے میں پختگی اور عارفانہ مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ انگریزی و اردو میں اعلیٰ نثر نگاری کے باوجود وہ خود کو شاعری جیسی تندخو نازنین سے الگ نہیں رکھ سکے مگر اس کی تندخوئی کو حلاوت آمیزیوں میں جس طرح انہوں نے بدلا ہے اور اس عشوہ طراز کو نئی نئی اداؤں کی وہ خوں آشام تلواریں عطا کی ہیں کہ جن پر وہ جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ انگریزی میں انور شیخ کی تصانیف کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے ان کے مقتدر جریدہ لبرٹی میں ان کے وقیع انگریزی مضامین کا مطالعہ کیا ہے اور اردو کی تحریریں بھی مجھے شاد کام کرتی رہی ہیں۔

اردو نثر میں انہوں نے تحقیق و تنقید اور فکشن کے میدانوں کو سر کیا۔ متعدد شعری اصناف سخن ایجاد بھی کیں، توسیع و تجدید سے بھی کام لیا۔ اس طرح وہ ہم سب کے تشکر و تمدیح کے مستحق بھی ٹھہرتے ہیں۔ ان کی ایجاد کردہ اصناف سخن میں تکونی، کہمن، متضاد نظم، غزالہ، منظومہ، محبوبہ، مکرولی اور تلخی خاص ہیں۔ ان میں تقریباً سبھی کی بنیاد غزل ہے کیونکہ تلفیظ و

منھ تکا کرے اور لوگ اسے ذہنی عدم توازن میں مبتلا سمجھیں۔ اس حیرتی کے سامنے جو شخص بھی آئے وہ اسے اپنا قاتل سمجھے۔ اس شعر کے مصداق:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

آخری شعر میں عاشق کے اطمینان کی گہری جھلک ہے، اس نے کلی کو گل بنتے ہوئے دیکھا ہے، اب گل کا سفر تابش جمال کی جانب جاری ہے، عاشق اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہا ہے، اک لطف لے رہا ہے، اس کی پریشانی کا باعث کچھ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب گل اپنے بھرپور جمال کی بساط پر ظہور کرے گا تو عاشق کیلئے سکون کا باعث ہوگا۔ یعنی گل جب اپنے پورے دریائے جمال میں غرق ہو جائے گا تو اس میں حیا کی شوخی بھی بھرپور ہوگی جو عاشق کے لئے اہمیت کی حامل ہے اور بیحد رومان خیز ہے۔ بقول امیر مینائی:

جواں ہونے لگے جب وہ تو ہم سے کر لیا پردہ
حیا یکلخت آئی اور شباب آہستہ آہستہ

یہی خیال جاں نثار اختر کے یہاں بھی بیحد خوبصورتی سے آیا ہے مگر فضا کی تبدیلی نے جاں نثار اختر کے شعر کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا ہے:

شگفتہ پھول سمٹ کر کلی بنے جیسے
کچھ اس کمال سے اس نے بدن چرایا تھا

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ اس کیفیت کا بیان نہایت سادگی سے جوش ملیح آبادی نے کیا ہے۔ یہ وہ عالم ہے کہ جب بچپن جوانی کی طرف مصروف سفر ہے۔ جوش فرماتے ہیں:

تن میں طوفان بو رہا ہے
یہ کون جوان ہو رہا ہے

جذبہ عشق کے مقدس آتش کدوں میں غسل کر کے الفاظ انور شیخ کی فکر میں در آئے ہیں اور نئے جہانوں کے در کھولتے ہیں۔ ان کے معاصرین میں جو فنکار ہیں وہ ان کا پرتو قبول بھی کرتے ہیں اور اپنی فکر کا پرتو ان پر ڈالتے ہیں لیکن انور شیخ ان فنکاروں میں ہیں جنہیں کسی عہد میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ وجہ اس کی صاف ظاہر ہے وہ تمام فنکار جنھوں نے قدیم غزل کو

پڑھا ہے، اسے اپنی فکر کا ایک حصہ بنایا ہے، وہ کسی بھی دور میں کسی بھی زمانے میں غزل کا شفاف اور رچا ہوا لہجہ تخلیق کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ عام طور پر غزل میں فکری رچاؤ کی بات کی جاتی ہے مگر رچاؤ کیا ہے عشق کا گداز اس کے رنگوں کا تموج، ایک ترنم ریز آبشار جو الفاظ کے باطن میں نقطۂ فراز سے گرتا ہے اور نشیب کی دور تک پھیلی ہوئی بساط کو سیراب اور شاداب کرتا ہے۔ ایسے الفاظ جو پیکراں ہیں، جن کی ہزاروں جہتوں پر تاخت اور حکومت ہے جو ہر طرح سے مستطیع، ثروت مند اور توانگر ہوتے ہیں۔

رومانیت کا لہجہ ہر دور میں بدلتا رہا ہے۔ انور شیخ نے محبوب سے تخاطب میں گل بدن اور جانم جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اپنا رومانی مزاج رکھتے ہیں اور عشق اور لگاوٹ کی ایک آگ ان کے خمیر میں موجود ہے۔ ان کا مزاج وہی ہے جو کہ تھا لیکن اسالیب کی تبدیلی نے ان میں ایک نئی شگفتگی پیدا کی ہے۔ پیرایۂ اظہار، ندرت اسالیب کا جلوہ ہر عہد میں ایک نیا پیکر بن کر سامنے آتا ہے۔ ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں وہاں کچھ اس طرح کا انداز ہے:

آنکھوں میں اس کی ہیرے کی کوئی کنی سی تھی
اس کی نظر نے کاٹ دیا آئینہ تمام

(غلام مرتضیٰ راہی)

چاند چمکا شفق ابھری ہوئی زرکار سحر
اس نے اک پرتو رخسار سے سو کام لئے

(کوثر جائسی)

پھر دمکتے جسم کا یاقوت لو دینے لگا
رات تابندہ ہوئی کچھ اور تابندہ ہوئی

(زیب غوری)

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انور شیخ نے اگر مصحفی، ناسخ، آتش، غالب کے لہجے کا ساتھ دیا ہے تو وہ اس عہد کا بھی ساتھ دے رہے ہیں۔ ان کے یہاں ادراک جمال اپنی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں بھی بدن کی تہذیب نکھری ہوئی ہے۔ جس پر ان کے عاشقانہ

مزاج کا پرتو پڑ رہا ہے۔ اپنی غزل کے متعلق خود ان کا خیال یہ ہے:

''جو لوگ مجھے روایتی شاعر کہہ کر دامن بچانا چاہتے ہیں ان کا رویہ میرے متعلق غیر منصفانہ ہے۔ میں غزل میں روایتی شاعر اس لئے ہوں کہ غزل محبت کی روایت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ صرف وہ شاعر و نقاد اس روایت سے روگرداں ہیں جو رسم محبت کو سمجھنے اور نبھانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ میدان نظم میں نہ میں صرف جدت پسند ہوں بلکہ انقلابی شاعر ہوں۔''

یہ بات تو سو فی صدی ہے کہ انور شیخ کی غزل کو کسی زنداں میں قید نہیں کیا جا سکتا، یہ ایک ایسے آزاد پرندے کی طرح ہے جس کے شہپروں کی گرفت میں وسعت کائنات ہے یعنی عہد قدیم سے لیکر عہد جدید تک اس کے وجود کو دیکھا جا سکتا ہے اور ان کی غزل کے مطالعہ سے مرزا جعفر علی خاں اثرؔ کا یہ شعر بار بار یاد آتا ہے:

ساز دل چھیڑ کے بھی توڑ کے بھی دیکھ لیا
اس میں نغمہ ہی نہیں کوئی محبت کے سوا

(اثر لکھنوی)

انور شیخ کی غزل سراپا محبت ہے لیکن جہاں عصری حسیت کی آتش سیال ان کی رگوں میں رواں ہوئی ہے وہاں وہ ایک انقلابی شاعر نظر آتے ہیں لیکن انہوں نے انقلاب کو بھی جمالیات کے حوالے سے دیکھا ہے اور یہ انداز سب سے خوبصورت اور منفرد ہے۔ وہ غزل کے متعلق اس نظریے کے قائل نہیں ہیں کہ اس کوزے میں دریا کو بند کیا جا سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ غزل ایک دریا ہے جس سے ہزاروں کوزے بھرے جا سکتے ہیں اور اس دریا کا پانی کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بات تو کسی حد تک معقول ہے، ایک دریا سے لاکھوں کوزے بھرے جا سکتے ہیں اور لاکھوں تشنہ لبوں کے کام آ سکتے ہیں لیکن اگر دریا کوزے میں سما جائے تو وہ محض ایک ہی فرد کو سیراب کرے گا۔ بنیادی قصہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ادب میں جو اصطلاح بھی وضع ہو جاتی ہے لوگ اسے لیکر دوڑ پڑتے ہیں اور حوالے دینے لگتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے بس کیا تھا لوگ جواز پیدا کرنے لگے کہ غزل کا لہجہ کھردرا ہے۔ غالب

کے مشکل اور پیچیدہ اشعار کو اسی زمرے میں رکھ دیا گیا۔ کسی نے کہا کہ غزل دریا کو کوزے میں بند کرنے کا نام ہے۔ بس سبھی چیخنے لگے لیکن کیا کسی نے اس انداز سے کبھی سوچا کہ دریا کتنا سیر چشم ہے، فیاض ہے کہ اپنا پانی لاکھوں کوزوں کو دیتا ہے تا کہ لاکھوں لوگ سیراب ہو سکیں اس حوالے سے انور شیخ کے یہ اشعار دیکھئے:

یہ کمال عشق ہے یا میری بیتابی کا جوش
جستجوئے یار میں ہوں بن چکا خانہ بدوش

بندہ ہوں جو بھی دے سکے پروردگار دے
لیکن نہ زلف یار سے مجھ کو رہائی دے

مانا کہ اس کا رخ ہے تبسم بھی ہونٹ بھی
پردہ جو یوں گرا دیا اچھا نہیں کیا

زندگی تو ہے اک پتنگا یہ وقت اڑتا ہوا شرارہ
جو ہر گھڑی ہی بھٹک رہا ہے تلاش شعلہ میں مارا مارا

جانتے ہیں زندگی کی اصل میں قیمت ہے کیا
ایک چنچل سی ادا ترچھی نظر وصل شبی

***

انور شیخ کی غزل میں علامت واستعارہ

طوطی زمعنی سخن خویش غافل است
ہر کس سخن و رست سخنداں نمی شود

(امیر خسرو)

علامت واستعارہ کے حوالے سے اگر انور شیخ کی غزل پر بات کا آغاز ہو تو حضرت امیر خسرو کا یہ شعر اہمیت کا حامل نظر آتا ہے کیونکہ سخن ور ہونا تو آسان ہے سخنداں ہونا مشکل ہے اور اگر کہیں سخن ور سخنداں ہو جائے تو اس پر تمام اسرار عالم منکشف ہو جاتے ہیں۔ پھر وہی طوطی جو سخن ور کا استعارہ ہے طوطی تو رہتا ہے لیکن سخندانی کے رموز کا انکشاف ہونے کے بعد پھر عالم حیرت میں غرق ہو جاتا ہے۔ جس کا بیان غالب کے اس شعر میں کیا گیا ہے:

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ

(غالب)

انور شیخ اس دوسری منزل پر فائز ہو چکے ہیں یعنی سفر تو انہوں نے سخن وری سے شروع کیا تھا مگر اب وہ سخندانی کے اسرار سے واقف ہیں اور سخنوری اب ایک سحر زدہ پرندے کی طرح ان کے قدموں میں پڑی کانپتی ہے گویا وہ سخن دانی کے حمام بادگرد کو فتح کر چکے ہیں۔ اب نہ حمام بادگرد ہے نہ سنگی مجسمے اور نہ طوطی نہ قفس۔ آخری تیر چل چکا ہے، سارا طلسم ٹوٹ چکا ہے اور سخن دانی کا الماس ان کے ہاتھوں میں جگمگا رہا ہے۔

انور شیخ کی غزل میں کوئی بھی مضمون باندھا جائے کیفیت یہی ہوتی ہے کہ گویا تپش شوق نے ہر ذرے پر ایک دل باندھ رکھا ہے، بیباکی، شوخی اور مکالماتی انداز جس میں ڈرامائی حسن کی آمیزش ہے ہمیشہ ہی پوری فضا پر محیط رہتا ہے ایک طرز تخاطب جس میں بلا

کی شوخی اور تیکھا پن ہے، معاملہ بندی ہو، رشک کے مضامین ہوں، ایک ندرت آفرینی نظر آتی ہے، ان کا مخاطب کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ زاہد ہو، مرشد ہو، ساقی ہو، معشوق ہو، گردش زمانہ ہو، روحِ عصر ہو، کچھ بھی ہو تکلم میں ایک آتش نہفتہ کی جولانی رقص کرتی ہے، ایک طنز ملیح کے ساتھ جس سے متعلق اس کتاب میں الگ سے ایک باب قائم کیا گیا ہے لیکن اس سے پہلے میں علامت واستعارہ کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ علائم، تشبیہ، کنایہ، استعارہ سب علم بدیع و بیان سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ صنعتیں شعر کی شوکت اور اس کے جمال کو دوبالا کرتی ہیں۔ استعارہ خود میں کئی اقسام رکھتا ہے، ان سب کا استعمال ایک اچھے شاعر کے یہاں فطری اور غیر ارادی طور پر ہوتا رہتا ہے۔ محسوسات کا رشتہ بھی ان تمام چیزوں سے ہے، اس صورت میں اشیاء کا حسن شعر کے ذریعہ نکھرتا ہے اور انور شیخ کے یہاں ان تمام جلووں کی فراوانی ہے، بیان براہ راست نہیں ہوتا ہے، بالواسطہ اظہار ہی معانی کو وسیع اور ضوفشاں افق فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں نامور ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ رائے قابل توجہ ہے:

> ''تخلیقی زبان چار چیزوں سے عبارت ہے۔ تشبیہ، پیکر، استعارہ اور علامت، استعارہ اور علامت سے ملتی جلتی اور بھی چیزیں ہیں مثلاً تمثیل، آیت، نشانی وغیرہ لیکن یہ تخلیقی زبان کی شرائط نہیں اوصاف ہیں۔ ان کا نہ ہونا زبان کے غیر تخلیقی ہونے کی دلیل نہیں، علاوہ بریں انہیں استعارے کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے لیکن تشبیہ، پیکر، استعارہ اور علامت میں سے کم از کم دو عناصر زبان میں تقریباً ہمیشہ موجود رہتے ہیں اگر وہ کم ہوں تو زبان غیر تخلیقی ہوجائے گی۔ یہ اصول اس قدر بیّن اور شواہد و براہین کے ذریعہ اسقدر مستند ہے کہ اس سے اختلاف شاید ممکن نہ ہو۔''

اس رائے سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ کچھ ہو یا نہ ہو لیکن زبان میں استعارہ اور علامت یقینی طور پر ہونا چاہئے جو اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شعر کی تخلیق زبان سے ہوتی ہے اور زبان کی خوبصورتی میں علامت اور استعارے کا ایک مقام ہے۔ اس سے شعری پیکر خوبصورت ہوجاتا ہے یا پھر دوسری دو چیزیں موجود ہونی چاہئیں لیکن اس سے پہلے کہ انور شیخ کے

یہاں سے مثال میں کچھ پیش کیا جائے ڈاکٹر انیس اشفاق کی یہ رائے بھی دیکھئے جس میں علامت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح استعارہ اور علامت کا فرق بھی سامنے آجاتا ہے:

''اظہار کا بالواسطہ پیرایہ یعنی ایک بات کہنا، اس سے دوسرے معنی مراد لینا ادب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس بالواسطہ اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔ استعارہ، کنایہ، تمثیل اور علامت جو بالواسطہ اظہار کا اہم ترین پیرایہ ہیں اور دوسرے پیرایوں سے بظاہر مشابہ ہونے کے باوجود ان سے مختلف ہیں۔

علامت سے مراد وہ بیان ہے جس کے ذریعہ جو کہا جائے اس سے کچھ زیادہ اور کچھ الگ معنی مراد لئے جائیں، علامت ہمارے ذہن کو معنی کی کئی جہتوں کی طرف منتقل کرتی ہے اور اس کی خوبی یہی ہے کہ ان میں سے وہ ہر جہت کے لئے موزوں قرار پائے، علامتی اظہار بجائے خود بیان واقعہ ہوتا ہے لیکن اس بیان واقعہ کے ظاہری مفہوم سے ذہن اس مفہوم کے مماثل کسی اور مفہوم کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ بیان واقعہ کسی شئے کا بھی ہو سکتا ہے، کسی وقوعے کا بھی اور کسی صورت حال کا بھی۔''

اس نظریے کی روشنی میں انور شیخ کے کچھ اشعار کا تجزیہ کرتے ہیں جس میں معنی کی کئی جہتیں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں اور ہمیں ان جہانوں تک لے جاتی ہیں جہاں سے عشق کی مستی ہی نظر آتی ہے مثلاً

کیا کروں میں صریر خامہ سے جب بھی لکھوں تری صدا آئے

غالب کے یہاں صریر خامہ نوائے سروش ہے۔ ان کے یہاں غیب سے مضامین خیال میں آتے ہیں۔ انور شیخ کے یہاں صریر خامہ میں صرف محبوب حقیقی کی آواز ہے ظاہر ہے وہ جب بھی لکھتے ہیں قلم بساط قرطاس سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ دائرے، قوسیں، خطوط اور زاویے بنانے لگتا ہے تو حروف والفاظ کے ساتھ ہی اس کی آواز بھی بساط قرطاس پر نزول کرتی ہے۔ حروف اور الفاظ تو قرطاس کی سطح پر مرتسم ہو جاتے ہیں لیکن آواز چونکہ نقش لوح وقرطاس نہیں ہوتی اس

لئے وہ طشت ساعت میں مسلسل تراوش کرتی ہے۔اس طرح صریر خامہ میں بس اسی کی آواز ہوتی ہے۔صورت یہی ہے کہ مجنوں ریگ صحرا پر جب انگلیاں پھراتا تھا تو لفظ لیلیٰ ہی بساط ریگ سے ابھرتا تھا۔گویا یہ لفظ اس کی انگلیوں کے اندر موجود تھا۔دوسرا کوئی لفظ اس کی انگلیوں میں تھا ہی نہیں تو ابھرتا کیسے۔اسی طرح صریر خامہ میں نہیں بلکہ شاعر کے سارے وجود میں اس کی آواز رقص کر رہی ہے۔جب وہ قلم قرطاس پر رکھتا ہے تو قلم کی نوک سے اس کی آواز ابھرتی ہے۔اس شعر میں حروف پوشیدہ ہیں کہ جو قلم سے برآمد ہوتے ہیں لیکن استعاراتی طور پر صاف ظاہر ہوتا ہے جس کی آواز ہے اسی کا نام بھی ہے۔ایک جدید غزل گو نے کیا خوب کہا:

میں جنبش انگشت میں محفوظ رہوں گا
ہر چند مجھے ریت پہ تو لکھ کے مٹا دے

(شاہد کبیر)

اور پھر عشق کی مستی تو وہ ہے کہ محبوب کی خوشبو پا کر عاشق لحد سے بھی رقصاں نکلتا ہے جیسا کہ حافظ شیرازی کے اس شعر میں بیان ہوا:

بر سر تربت ما با مئے و مطرب بنشیں
تا بہ بویت ز لحد رقص کناں برخیزم

(حافظ شیرازی)

انور شیخ کے ایک دوسرے شعر میں محبوب کی آواز کی کیفیات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

تری سرگوشیوں سے کوئی خوش تر
زمانے میں بھلا آواز کیا ہے

اس شعر کی خوبی یہی ہے کہ اس میں سرگوشی میں نغمگی میں جو ترنم ہے جو غنائیت پوشیدہ ہے اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔شاعر خوب سمجھتا ہے کہ محبوب کی سرگوشی کن لمحوں میں نغمات کا ایک جہان عنبریں وآتشیں کھولتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اس سرگوشی کی تہہ سے ابھرنے والے نغمے میں مست رہنا چاہتا ہے اور زمانے کی دیگر اشیاء خاص طور پر آوازیں اسے خوش نہیں آتیں اور وہ اس سرگوشی میں گم ہو کر ایک نئی دنیا تلاش کرتا ہے۔اس طرح سرگوشی میں اقرار کی لذت بھی ہے، سپردگی کی ادا بھی اور یہ کیفیت علامت کے طور پر بے حد خوبصورت استعمال ہوئی ہے۔

غالبؔ نے بلبل کے نغمہ سنج ہونے کو بہار کی آمد کا سراغ بتایا ہے اور زبان طیور کی اڑتی سی خبر کہہ کر سرگوشی کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر انور شیخ کے شعر کی مستی اس کی اپنی ہے۔

علامت کے سلسلہ میں سب سے اہم پہلو جو سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ ہر لفظ علامت ہوتا ہے۔ میں اس کو ایک بڑے کینوس پر دیکھتا ہوں۔ مثلاً ہوا، پانی، آگ، آئینہ، پھول، روشنی اور تاریکی سب اپنے آپ میں علامتیں ہیں کیونکہ جب یہ بات ایک کلیہ قرار پا چکی کہ شاعری میں مظاہر فطرت ہی مظاہر فطرت کی معنوی تہہ داری کے عکاس ہیں اور زندگی کی معنوی کیفیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو پھر ہر لفظ علامت ہے۔ الفاظ کے استعمالات کو دیکھنا چاہئے۔ یہ بات سب سے زیادہ فارسی کے باکمال شاعر عرفی شیرازی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ خود عرفی نے کہا بھی ہے کہ ''تحقیق آنست کہ لفظ علامت است مقصود بالذات'' اس میدان میں کئی مغربی مفسرین و ناقدین نے بھی علامت سے متعلق یہی بات کہی ہے۔ ہمارے یہاں اردو میں غالب، میر، سودا سب کے یہاں اس رنگ میں کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔ یہاں اردو کے متقدمین، متوسطین، متاخرین سب کے یہاں اس کیفیت کا نظارہ کیا جا سکتا ہے اور فارسی شاعروں کے یہاں تو اس کی کثرت ہے مثلاً میر کہتے ہیں:

تیز رکھیو سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

(میر)

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

(غالب)

نکلے ہیں سیر کرنے شہیدانِ فصل گُل
خاک چمن سے بھیس بدل کر گلاب کے

(سیماب)

جنوں میں وادیٔ پرخار سے بھی گزرا ہوں
مگر یہ کیا کہ مرا پیرہن سلامت ہے

(ندرت کانپوری)

مری گرفت سے آکر نکل گئی تتلی
پروں کے رنگ مگر رہ گئے ہیں چٹکی میں

(شکیب جلالی)

اپنا ہو تو رگ رگ میں سما جاتا ہے میری
بہتا ہے وہی خون تو میرا نہیں لگتا

(غلام مرتضیٰ راہی)

ان اشعار میں قابل دید مناظر یہی ہیں کہ مظاہر فطرت اور اشیاء کو شعر میں اس انداز سے استعمال کیا گیا ہے کہ ان کا وجود زندگی کے بے حد قریب ہوتا چلا گیا ہے اور اس طرح ہر لفظ علامت کی شکل میں ابھرتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ انور شیخ کے اشعار سے اور مثالیں لائی جائیں، میں صائب تبریزی کا یہ شعر پڑھتا ہوں، ہر لفظ ایک علامت بن کر نمودار ہوا ہے اور علامت کا افق کس قدر وسیع ہو گیا ہے:

از بال و پر غبار تمنا فشاندہ ایم
بر شاخ گل گراں نہ شود آشیانِ ما

(صائب)

صائب تبریزی کے اس شعر میں زندگی کا عظیم فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔ وہ بال و پر کہاں ہیں جن پر غبار تمنا بیٹھا ہوا ہے۔ پہلے اسے جھاڑ دیا جائے کیونکہ یہ غبار آشیاں پر بوجھ بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک تو بال و پر کا بوجھ اس پر مستزاد بال و پر پر جمی ہوئی گرد تمنا۔ تمام الفاظ ہماری اسی دنیا کے ہیں، آشیاں، بال و پر، غبار، گراں ہونا یعنی بوجھل ہونا، فشاندگی یعنی جھاڑ دینا، بال و پر کو ہلکا کر دینا، علامتوں کا ایک طلسم ہے کہ سامنے کھڑا ہے۔ بس فاتح طلسم کا منتظر ہے کہ وہ لوح طلسم لیکر آئے، طلسم کو توڑے اور بکھیرے نیز اس کی تہوں میں اترتا چلا جائے۔ یہ ہے دراصل بڑی شاعری کی پہچان، علامت کی کیفیت کا بیان۔ اب اس حوالے سے آپ انور شیخ کے کچھ اشعار دیکھئے جس میں اس دنیا کی چیزوں کو کس قدر بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے:

جل سکا چراغ دل کب کسی کے نور سے
ہم گئے ملا نہ کچھ پر ضیائے طور سے

تخئیل میں وہی گداز اور وہی شوخی ہے جو غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان سب کا اجمالاً ذکر آگے آئے گا کیونکہ اس صحرائے بسیط اور عریض میں میرا توشۂ سفر دراصل انور شیخ کی غزل ہے لیکن دیگر تمام اصناف سخن کا اجمالی جائزہ بھی ضروری ہے۔

کم وبیش آٹھ اصناف سخن انور شیخ کی ایجادات میں سے ہیں۔ خلاق اعظم کا شاہکار ہونے کی وجہ سے ایجادات کی عظیم منزلوں پر فائز ہونا ایک فطری امر ہے۔ خصوصی اصناف سخن میں مکالمہ اور تمثیلچہ بھی ہیں لیکن غزل کے تیور، اس کا لسانی نظام ان کے یہاں بے حد منفرد ہے، جاں گداز ہے۔ انہوں نے غزل جیسی ہزار شیوہ صنف سخن کے ان تمام تقاضوں کو پورا کیا ہے جن سے اس کا حسن عبارت ہے۔ انہوں نے اس عشوہ طراز حسینہ کے خطوط جسم کا ہر پہلو سے جائزہ لیا ہے اور اسے اپنی شراب فکر سے مزید سرشاری عطا کردی ہے، یوں کہنا چاہئے کہ اس ناظورۂ ناز آفریں کی رگوں میں خون کے بجائے ایک ایسی شراب رواں ہے جس نے اس کے حسن کو دوبالا کردیا ہے اور اس ساز کی لے کو دوام بخشا ہے، رنگ رخسار کو مزید گہرا کیا ہے۔

انور شیخ کی غزل مختلف جہتوں کے مطالعے پر اُکساتی ہے۔ خاص طور پر لسانی و لفظی نظام، رومانیت، علامت نگاری، عصری شعور، حواسی پیکر، کلاسیکیت کے رشتے، ادراک جمال، طنز و مزاح ان تمام پہلوؤں سے اگر ان کی غزل کا جائزہ لیا جائے تو بنات النعش گردوں کا ایک رقص نظر آتا ہے۔ میں ان تمام پہلوؤں پر ان کی غزل کے حوالے سے بات کروں گا کیونکہ غزل ہی انور شیخ کی شخصیت کا ایک واشگاف اظہار ہے اور ان کی فکری ثروت مندی سے مالا مال ہے لیکن میں یہاں کچھ دیگر پہلوؤں کو بھی دیکھتا ہوں جو ان کے تفکیری مزاج اور شوق فراواں کی گرہ کھولتے ہیں۔ ان کے یہاں مکافات عمل سے غافل نہ ہونے کی تلقین بھی ہے۔ بعض مقامات پر نہیں بلکہ بیشتر مقامات پر وہ رومی کی زبان میں اظہار کرتے ہیں جہاں عشق تمام بیماریوں کا علاج ہے اور انسان کا عظیم سرمایہ بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ جس سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں وہاں کے ذرے ذرے میں عشق انگڑائیاں لے رہا ہے، حسن چھلکتا رہتا ہے، جمال بے پایاں کے مناظر دکھائی دیتے ہیں اور اس خطے پر شفیق فطرت کا دست مہرباں سایہ فگن ہے۔

اس شعر کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ شعر چراغ کی اس کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں وہ کسب نور نہیں کرتا بلکہ اس کی آتش سوزاں ایک شعلہ جوالہ کی طرح اس کے اندر سے لپکتی ہے۔ جو اس کو روشن کر دیتی ہے۔ جہاں کرمک ناداں طواف شمع نہیں کرتا بلکہ اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو جاتا ہے وہیں سے کسب نور کرتا ہے۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ چراغ کی لو میں آئینہ پنہاں ہوتا ہے اور آئینہ میں چراغ کی لو سانس لیتی ہے ظاہر ہے کہ اس شکل میں یہ کیفیت ایک ایسے سنگ چقماق کی طرح ہوتی ہے جس کے سینے میں سیلاب شرر ہے جو اپنے سیلاب شرر سے اپنی کشت حیات کو پہلے پھونکتا ہے، خاکستر کرتا ہے پھر اسے شاداب و سبز بھی اسی سے بناتا ہے۔ جس کیلئے بیدلؔ نے کہا ہے کہ ''آتش دل شد بلند از کف خاکسترم''

انور شیخ کا کہنا ہے کہ چراغ طور مجھے کیا دے گا۔ میرا چراغ کسی کے نور سے نہیں اپنے ہی نور سے جلے گا۔ اس شعر میں علامتوں کی ایک دنیا ہے۔ یوں دیکھئے تو چراغ، سے طور سے، ضیا سے، ان تمام الفاظ سے رعایت لفظی کا حسن تراوش کرتا ہے لیکن اس کے باوجود چراغ اپنے سرمائے کو اپنے سینے میں چھپا کر رکھتا ہے، جب چاہتا ہے اس کو نمودار کر کے دکھا دیتا ہے۔ اس شعر کے مصداق:

شاخ گل کب سے ہے سینے میں چھپائے ہوئے گل
جانے کب باد صبا اذن چمن کاری دے

(سردار جعفری)

اس طرح انور شیخ کے اس شعر میں ہمہ جہت پہلو نکلتے ہیں۔ اہم پہلو زندگی کی خودداری ہے یعنی ''گل مراد شگفت از سفال خویش مرا'' انور شیخ کی ایک دوسری غزل کا یہ شعر دیکھیں:

غوطہ زن کس لئے ہوں اے انورؔ
وہ جو گہری تھی آبجو نہ رہی

واضح طور پر شاعر اس شعر میں یہ اشارہ کر رہا ہے کہ شناوری، غوطہ زنی اس کا مزاج ہے اس کو بیکراں عظیم الشان پر شکوہ سمندروں سے گہری دلچسپی ہے لیکن یہ کس قدر تلخ اور بے کیف لمحۂ یاس ہے کہ آج اس کے پاس محض ایک آبجو ہے وہ بھی گہری نہیں ہے۔ اس صورت میں غوطہ زنی اور شناوری کے تو سن شوق کو جو مہمیز لگی ہوئی ہے وہ کس قدر افسردگی سے دوچار

ہے۔اس شعر میں غوطہ زن ہونا دراصل زندگی کی کشاکش سے الجھتے رہنا ہے۔آبجو زندگی کا ایک محدود گوشہ ہے،اس کا گہرا نہ ہونا دراصل اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعر اب اپنی غوطہ زنی اور شناوری کا پرچم کہاں بلند کرے۔غالب نے اسی کیفیت کے روبرو آ کر کہا تھا:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

(غالب)

اسی قبیل میں ایک شعر ہوش اصفہانی اور ایک شعر اصغر گونڈوی کا بھی قابل ذکر ہے:

مشکل پسند ذوق ہے دشواریوں کا دوست
تھک جاتا ہوں میں راہ کو ہموار دیکھ کر

(ہوش اصفہانی)

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

(اصغر گونڈوی)

اب آیئے انور شیخ کے اس شعر کے طلسم کو بھی دیکھیں جو بادی النظر میں تو معمولی لگتا ہے مگر اپنے اندر جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ہے:

مثل برگ اگرچہ بکھر گئے
ان کے زیر پا نہ آسکے

شعر میں قابل غور لفظ برگ ہے اس کا بکھرنا یعنی شاخ سے جدا ہونا اہم ہے۔یہاں یہ شوق موجیں مار رہا ہے کہ شاخ میں رہ کر اگر میں موسم کی سفاکی سے زرد بھی ہوجاؤں اور زرد ہوا کی شمشیر میرے رشتۂ حیات کو منقطع بھی کردے تو کیا میں اس کے زیر پا آجاؤں گا۔اس کا لمس مجھے سرسبز و شاداب کردے گا۔خواہ میں اپنے شجر میں واپس لوٹوں یا نہ لوٹوں لیکن مجھے اس کے زیر پا آکر ایک حیات جاودانی نصیب ہوجائے گی پھر نہ مجھے موسموں کا خوف رہے گا۔کب ہوائے سبز گلشن میں چلے گی،کب نخل ثمر آور ہونگے،کب پھل پھول آئیں گے اور کب بادخزاں کی تلوار ایک ایک کر کے سارے رشتہ ہائے حیات کو ختم کردے گی۔ظاہر ہے کہ پتہ حیات

جاودانی کی تلاش میں اپنی شاخ سے جدا ہوا پھر ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا کوچۂ محبوب میں پہنچا مگر محبوب نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ اسے اپنے قدموں سے مسل دیتا۔ اصل میں پتے کو حیات جاودانی سے بہرہ ور ہونا تھا مگر ایسا نہ ہوا۔ شعر دراصل سینہ برگ کے اندر پوشیدہ آواز گریہ ہے، ایک کرب ہے جو مسلسل پتے کے وجود میں متمکن ہے اور اپنا اظہار کر رہا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ہماری پرانی اردو شاعری میں اس طرح کا مفہوم شاذ ہی باندھا گیا ہے۔ برگ و بار کو اس طرح محبوب کے قدموں سے لپٹنے کی تمنا کہیں نہیں دکھائی گئی لیکن نئی اردو غزل میں اس طرح کے مفاہیم باندھنے کی بھرپور کوشش ہے لیکن برگ آوارہ و بے وطن کے قدم محبوب سے لپٹنے کی خواہش وہاں بھی نہیں ملتی۔ مثلاً کچھ شعر پیش کرتا ہوں جن میں برگ کی مختلف کیفیتوں کی طرف اشارہ ہے:

زرد پتے کہ آگاہِ تقدیر تھے ایک زائل تعلق کی تصویر تھے
شاخ سے ان کو ہونا تھا آخر جدا ایسی اندھی ہوا کی ضرورت نہ تھی

(باقی)

شاخ کے بعد زمیں سے بھی جدا ہوتا ہے
برگ افتادہ ابھی رقص ہوا ہوتا ہے

(عرفان صدیقی)

ہوا نے توڑ کے پتہ زمیں پہ پھینکا ہے
کہ شب کی جھیل میں پتھر گرا گیا ہے کوئی

(شکیب جلالی)

ان اشعار میں وہ کیفیت نہیں ہے جو انور شیخ کے شعر میں موجود ہے۔ وہ تمنا جو سینہ برگ میں چراغ کی طرح روشن ہے۔ ظاہر ہے کہ محبوب کے قدموں کے لمس کے اعجاز سے پتہ بخوبی واقف ہے اس لئے اس نے خود کو جاوداں بنانے کے لئے یہ قدم اٹھایا ہے کہ وہ شاخ سے ٹوٹ کر وہاں پہونچا ہے جہاں حیات غیر فانی قدموں کے لمس سے تقسیم کی جاتی ہے۔ تمام سنگ و برگ راہ میں پڑے ہیں اور ان کی آنکھوں سے یہ آرزو مترشح ہے۔ یہ امید درخشاں ہے ان کے اندر کہ کبھی وہ اس راہ سے گزر جائے اور اپنے بوسہ پائے مرمریں سے نوازے اور ہم میں زندگی لوٹ آئے۔ اس سطح پر دیکھیں تو انور شیخ کا شعر بہت سی عظمتوں کا حامل ہے۔

علامت کے بیان میں اشیاء اور مظاہر فطرت کی بے حد اہمیت ہے جیسا کہ میں نے

سطور بالا میں عرض کیا۔ علامت کے ضمن میں میں نے بتایا کہ انور شیخ کے اشعار کی کیا عظمت و کیفیت ہے۔ اس طرح انہیں کسی زمانے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ قدیم ہو یا جدید ہر جگہ ان کی کارفرمائی ہے۔ لازم ہے کہ اب ان کی غزل میں استعارے سے متعلق کچھ گفتگو ہو کہ ان کے اشعار میں استعاریت کا کیا حسن ہے۔ اس سے پہلے کہ میں انور شیخ کی غزل کے استعاراتی نظام پر بات شروع کروں۔ استعارے کے متعلق یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ کیا ہے؟

''سہل ترین ضابطے میں جب ہم استعارے کا استعمال کرتے ہیں تو ہمارے پاس کسی ایک لفظ یا جملے سے مکفول اور باہم متحرک اشیاء کے دو تصور ہوتے ہیں جن کے معنی اس کے تفاعل کا نتیجہ ہوتے ہیں (رچرڈس)۔ استعارے سے متعلق یہ رائے اہم ہے، اس کی قدر کی جانی چاہئے۔ رچرڈس ارسطو کے مکتبۂ نقد و نظر کا ایک اہم ترین رکن ہے۔ دیگر ناقدین نے بھی اپنے اپنے طور پر استعارے کی تعبیر و تشریح کی ہے لیکن سب سے اچھی بات تثلیث فلاسفہ کے رکن سوم ارسطو نے کہی ہے ''دو مختلف اشیاء کے درمیان مشابہتوں کا ادراک'' میرے خیال میں سب سے زیادہ بنیادی اور مرکزی حیثیت اسی کی ہے۔ ہمیں اسے ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے اور انور شیخ کی غزلوں میں اشیاء کی ماہیئت ان کے استعمالات کو کسی انداز سے دیکھا جائے لیکن پیش نظر یہ رائے بھی رہے۔

> ''استعارے کی تفتیش شعور کے بنیادی ادراکات کی طرح ہے اور اگرچہ استعارہ شاعری کی بہت ترقی یافتہ شکل میں نظر آتا ہے، قوت بیان کا ایک اہم انداز ہے لیکن یہ ایک ایسا کلیاتی انداز بھی اختیار کر سکتا ہے جس میں ہمارا تمام علم اور تجربہ ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہو جائے۔'' (مڈلٹن)

یہاں یہ نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ یورپی ناقدین نے تو ارسطو کے بہت بعد میں علم بدیع و بیان پر بحث کی۔ علامت، استعارہ، کنایہ، تمثیل، تشبیہ پر تعبیر و تشریح کے دریا بہا دیئے لیکن عربوں نے سب سے پہلے ارسطو کے نظریات کی توسیع کی، وہ نظریات جو ارسطو کی بوطیقا میں سب سے پہلے نمایاں ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں علامہ ابن جاحظ، ابن رشیق، قدامہ ابن جعفر کے ناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ عربی شاعری میں ہر چند کہ وہاں غزل نہیں ہے لیکن غزل

کا سرچشمہ قصائد میں موجود ہے۔ خاص طور پر ان قصائد میں جو طلوع اسلام سے قبل کے شعرا کے کہن فکر سے ڈھل کر نکلے ہیں۔ ان میں استعاروں کے خوبصورت پیکر ہیں اور استعارے کی ساری اقسام کو کسی نہ کسی طرح ان میں پیش کیا گیا ہے۔ میں یہاں عمرو بن کلثوم التغلبی کے معروف زمانہ قصیدے میں سے دو شعر پیش کروں گا جو معلقات میں شامل ہیں۔ مقصد محض استعارے کی کیفیت کو واضح کرنا ہے کہ عربوں کے یہاں اس کا انداز کیا ہے۔ اپنی عربی دانی کی نمائش مقصود نہیں ؎

الاهبی بصحنک فاصبحینا

ولا تبقی خمور الاندرینا

(ترجمہ) اے ساقیہ! ساغر اٹھا، ہمارے حضور جام صبوحی پیش کر کہ اندرین کی شراب کا ایک قطرہ نہ بچنے پائے۔،،

ملانا البرّا حتی ضاق عناً

وماء البحر نملاه سفینا

(ترجمہ) ہم نے افراد کے ذریعہ زمین کو اتنا بھر دیا کہ اس میں جگہ باقی نہ رہی اور سمندر کے پانی کو ہم نے اپنے کشتیوں کے ڈھانپ دیا۔،،

عربی زبان کی فصاحت و بلاغت اسی میں ہے کہ کم لفظوں میں بڑی بڑی باتیں کہی جائیں۔ تغلبی کے شعر اول میں شراب زندگی کا استعارہ ہے، نشاط کا استعارہ ہے کہ شاعر جسے اپنی رگ رگ میں سمو لینا چاہتا ہے۔ دوسرے شعر میں وحدت میں کثرت کا جلوہ پیش کیا گیا ہے جس سے عربوں کا شکوہ ظاہر ہوتا ہے۔ سمندر کے پانی کو کشتیوں سے ڈھانپ دینا تکثیریت کی طرف اشارہ ہے اور ایک طرح سے تبختر کا انداز بھی ہے۔ جس میں فتوحات کا پہلو بھی موجود ہے۔ پوری عربی شاعری اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں انور شیخ کے یہاں استعارہ کس انداز سے جلوہ پذیر ہوا ہے کیونکہ انور شیخ کی نگاہ بھی عالمی ادب پر بے حد مضبوط و مستحکم ہے:

نمائش سے نہیں ملتی نہ بنتی ہے حقیقت سے

نہ جرأت ہو تو ہر تلوار اک رنگیں تماشا ہے

سہانے خواب کی تعبیر تم سے کیا پوچھوں
یہ بلبلہ ہے اسے چھیڑ کر ملے گا کیا

ہر ذرۂ جہان یہاں محو رقص ہے
شاید یہی ہے راز بقا ناچ ناچ ناچ

شعر اوّل میں کلیدی لفظ تلوار ہے جو اس شعر میں ایک ایسی انسانی ذہانت کا استعارہ ہے جو منفی انداز میں کام کرتی ہے۔ ذہانت اور علم و وجدان یہ تمام چیزیں درجۂ اشرافیت میں شمار کی جانے والی مخلوق یعنی انسان کا بیش بہا سرمایہ ہیں لیکن ان کا مثبت استعمال تعمیر حیات کی راہیں کھولتا ہے جبکہ منفی استعمال تخریب کے کھنڈرات کو جنم دیتا ہے اس لئے شاعر نے خاص لفظ تلوار کو جرأت سے ہم آہنگ کیا ہے اور یہ صفت ایسی ہے کہ انسان میں نہیں پائی جاتی ہے۔ ذہن ہوتا ہے مگر جرأت مند نہیں ہوتا یہ کوئی کلیہ نہیں ہے کہ ذہین آدمی جرات مند بھی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں تلوار یعنی ذہانت ایک رنگین تماشا بن جاتی ہے۔ اس کا حصول نمائش سے بھی ممکن نہیں، حقیقت سے بھی ممکن نہیں۔ اصل جوہر جرأت ہے یعنی اس تلوار کا جوہر خوش آب جرأت مندی ہے اور ضروری نہیں کہ یہ جوہر تلوار میں مسکن گزیں ہو۔ شعر ثانی میں کلیدی لفظ بلبلہ ہے یعنی حباب جو استعارہ ہے خواب کا۔ جس طرح آب رواں میں حباب بنتے بگڑتے ہیں، تخلیق ہوتے ہیں، فنا ہو جاتے ہیں، اسی طرح خواب بھی ہیں جو بلبلوں کی طرح بنتے بگڑتے ہیں۔ ہماری اردو شاعری میں بلبلوں اور حباب کا ذکر نہایت معقول طریقہ سے آتا رہا ہے مثلاً:

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا آدمی بلبلہ ہے پانی کا

(میر)

راہ فنا میں جاتے ہیں بیباک سر کے بل
دیکھے نہیں ہیں پاؤں کسی نے حباب کے

(سیماب)

انور شیخ نے خواب کو بلبلہ بتایا ہے جو ایک بلیغ استعارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سہانے خواب کی تعبیر اپنے محبوب سے پوچھنا نہیں چاہتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ جس طرح بلبلہ چند لمحات کا مہمان ہوتا ہے اسی طرح خواب بھی۔ جب تک اس کی حیات فطری قائم ہے رہے

گا، کچھ دیر بعد فنا ہی اس کا مقدر ہے۔ اس لئے کوئی سوال کیوں اٹھایا جائے بلکہ اس کے منظر فنا کو دیکھا جائے۔ اس طرح انہوں نے لفظ بلبلہ سے پوری انسانی زندگی کی تشریح پیش کی ہے اور کسی حد تک یہ شعر میر کے شعر سے قریب پہونچ جاتا ہے، جس کی مثال میں نے سطور بالا میں دی تھی۔ عجیب بات ہے کہ بہتے ہوئے پانی میں بلبلوں کے وجود پذیر ہونے اور عدم آباد کی طرف جانے کا منظر جس قدر دلچسپ ہوتا ہے اسی قدر ذہن کی بساط پر خوابوں کے قوس قزحی رنگوں کا بکھر جانا اور پھر تحلیل ہو جانا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ شاعر نے بلبلہ اور خواب کے حوالے سے ایک جاوداں حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تیسرا شعر تو اپنی استعاراتی فضا میں بے حد بسیط و بلیغ ہے۔ اس شعر میں ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی زندگی کو جس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے زندگی کا تسلسل، اس کی سرمستی، اس کی بے نیازی، ان تمام اوصاف کو ذرہ، بقا، رقص، ناچ ناچ جیسے لفظوں سے ابھارا گیا ہے۔ صوفیا کے یہاں رقص کی بے حد اہمیت ہے۔ رومی کے یہاں رقص کا ایک خاص مقام ہے جس میں عرفان الٰہی کی منزلیں پوشیدہ ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر اس کائنات پر محیط زندگی کو دیکھیں تو ہر ذرہ رقص میں ہے، ہر منظر متحرک ہے، ایک گردش پیہم ہے جس سے یہ کائنات زندہ ہے۔ زمین خود میں رقاصہ خلا ہے جس پر ہم سب صدیوں سے بود و باش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا وجود بھی گردش و تحرک سے عبارت ہے۔ انور شیخ نے زندگی کی اسی کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے شاید یہی ہے راز بقا ناچ ناچ ناچ۔ ظاہر ہے کہ اگر جمود آتا تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ تمام عناصر حیات میں رقص کی کیفیت موجود ہے۔ ذرہ میں سیلاب شرر کے رقص نے انسان کو ایجادات کی نئی بلندیوں سے ہمکنار کیا ہے لیکن رقص شرر سے تخریب کے پہلو بھی برآمد ہوئے ہیں لیکن گردش و تحرک گویا یہ فطری عمل ہے زندگی کو محفوظ رکھنے کا۔ ذرہ کے بطن میں آتش کدے اور چنگاریوں کے ہاتھوں میں رقص کے پرچم تعمیری حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اس شعر کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے اسی رقص سے عشق کے وہ زمانے بھی ابھرتے ہیں جن کا نام و نشان ابھی عصری تقویم میں نہیں ہے، ظاہر ہے کہ نا آفریدہ زمانے جن کی آہٹیں تو محسوس ہوتی ہیں مگر ابھی ان کے خدوخال نظر نہیں آتے، اس طرح یہ پوری کائنات ایک رقص گاہ بن جاتی ہے۔ یہاں یونانی فلسفہ نگار فیساغورث کے اس قول کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ تمام اجرام فلکی رقص میں ہیں اور ان کے رقص سے ایک ناشنیدہ دُھن ابھر رہی ہے جسے انسانی سامعہ

اپنی گرفت میں لینے سے قاصر ہے لیکن دیگر مخلوق تک اُن آوازوں کی ترسیل ہوتی ہے۔اس طرح رقص گاہ کائنات میں سب کچھ اپنی بقا کے لئے گردش وتحرک سے ہمکنار ہے۔انور شیخ نے اس شعر کی تشریح میں اور بھی پہلو رکھے ہیں کہ زندگی اپنے راز فنا سے واقف ہے لیکن وہ خوب سمجھتی ہے کہ لمحۂ فنا یا مستیٔ فنا ایک مخصوص کیفیت میں ہے اور اسی لمحۂ فنا کے ابر نیساں سے ایک جاوداں قطرہ زندگی کے بطن صدف میں گرے گا اور پھر ایک گوہر آبدار کی نمود ہوگی ایسا گوہر آبدار جس کا ہر رنگ جاوداں ہوگا اس کے تموج رنگ سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی وہ عشق کے ایوان میں سب سے درخشاں، سب سے روشن، سب سے منور ہوگا، اس تمثیل میں انور شیخ کے یہ اشعار بھی قابل ملاحظہ ہیں:

اگر چہ ہے رخ جاں مثل آتش
مگر اس کو ملا دل زمہریری

سرخیٔ خوں نے ابھی مانی نہیں دل کی بات
زردی رخ کی اداسی نے یہ بدنام کیا

مرقع حوادث کا یہ زندگانی
نہ جینے سے تو ڈر سنبھل جا سنبھل جا

نہ کسی کا میں نہ کوئی مرا نہ کسی کو میری جستجو
یہ جہان، فانی، گر کروں تو کروں میں کس کی آرزو

ہو عکس ماہ و مہر یا تنویر کہکشاں
تیری ہی اک مثال ہے اب مسکرا ذرا

ہم نے آہوں کا گلا خود ہی دبایا انور
کیا کریں دل کو گوارا نہ تھی تشہیر تری

***

انور شیخ کی غزل میں حواسی پیکروں کا طلسم

تا یکے شاہد معنیٰ بکشد بند نقاب
عمرہا بر در اندیشہ اقامت باید
(عرفی)

مذکورہ بالا عنوان کے تحت ہم انور شیخ کی غزل میں پیکر تراشی سے متعلق گفتگو کریں گے۔ چونکہ پیکر بہر حال حواس خمسہ کا ایک حصہ ہے اور جس کی جامع تعریف کچھ اس طرح ہے:

''وہ لفظ جو حواس خمسہ میں کسی ایک (یا ایک سے زیادہ) کو متوجہ اور متحرک کرے پیکر ہے یعنی حواس کے اس تجربے کی وساطت سے ہمارے متخیلہ کو متحرک کرنے والے الفاظ پیکر کہلاتے ہیں، کبھی کبھی حواس کے مختلف تجربات پیکر یا پیکروں کے ذریعہ اس طرح مل جل کر محسوس ہوتے ہیں، ایک خوشگوار لیکن مکمل وضاحت سے ماورا امتزاج کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔'' (شمس الرحمٰن فاروقی)

جمال الدین عرفی شیرازی نے اپنے مذکورہ بالا شعر میں یہی بات کہی ہے کہ جب معنی کا معشوق نقاب نہیں اٹھاتا ہے ایک اندیشہ سا برقرار رہتا ہے، ہم سب کو در اندیشہ پر مقیم رہنا چاہئے۔ پیکر کی تعریف میں بیدلؔ نے بھی کیا خوب کہا ہے ؎

چو حباب غیر لباس تو چہ توقع و چہ ہراس تو
نہ تو مانی و نہ قیاس چو کشند جامہ ز پیکرت

اس عمیق و بسیط موضوع پر بات شروع کرنے سے پہلے لفظ اور اس کے سلسلۂ نسب کا جائزہ لینا ضروری ہے کیونکہ ہمارے متخیلہ کو متحرک کرنے والے الفاظ ہی سے پیکروں کی تشکیل ہوتی ہے۔ لفظ سے متعلق اردو کے سربرآوردہ ناقد ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ رائے دیکھئے:

''آگہی کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب بچہ پہلی بار اپنی زبان

سے کوئی لفظ ادا کرتا ہے، مصر کے اہراموں میں سے ایک پر یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ کائنات کی ابتدا لفظ سے ہوتی ہے، پرانا عہد نامہ بھی اس کی توثیق کرتا ہے، پہلا لفظ نام ہے جب تک بچہ رحم مادر میں تھا یا پیدائش کے بعد جب تک وہ اپنی ماں سے چمٹا رہا تو ماں کو اس بے خال و خد کائنات سے الگ نہ کر سکا جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہے لیکن اس کے بعد جب وہ پہچان کے مرحلے میں داخل ہوا تو پہلی بار اس نے ماں کو ماں کہہ کر پکارا تو گویا ماں کو کائنات سے الگ کر کے ایک پوری شخصیت تفویض کر دی۔ تشخص کا یہ عمل ہی آگہی کی ابتدا کا عمل تھا۔''

اب آیئے عہد نامۂ نو کی بھی چند سطور پر نظر ڈال لی جائے جو کلام سے متعلق ہیں اور ان اسرار کو فاش کرنے کا سلیقہ سکھاتی ہیں جن کا فاش ہونا انسانی زندگی کیلئے بے حد اہمیت کا حامل ہے:

''ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔ سب چیزیں اسی کے وسیلے سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ بھی پیدا ہوا اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر نہیں پیدا ہوئی اس میں زندگی تھی وہ زندگی آدمیوں کا نور تھی اور وہ نور تاریکی میں چمکتا تھا۔''

گویا ظاہر ہوا کہ لفظ بھی اس کائنات میں اکائی ہے جس سے انسان کا اظہار و تشخص وجود میں آتا ہے، لفظ آواز کا پیکر ہے، بے خد و خال آواز کو خد و خال دیتا ہے، اور محسوسات کے پیکروں میں ڈھل کر زندگی کے دھاروں کو موڑتا ہے، براہ راست سامعہ پر اثر انداز ہوتا ہے، کیونکہ لفظ کی تہہ میں موسیقی کا ایک سمندر موجیں مار رہا ہے، اگر انسانی ذہن پر لفظ کی تفہیم نہ بھی ہو سکے تب بھی اس کا آہنگ انسان کو متاثر کرتا ہے اور جب لفظ کی صورت کشی کی جاتی ہے تو وہ تصویر بھی انسان کو دلکش نظر آتی ہے۔ غنائیت، ترنم، دلکشی، خوابوں کے جزیروں میں بہا لے جانے والی کیفیتیں لفظ کی رگ و پے میں خون کی طرح رواں دواں رہتی ہیں۔ لفظ چونکہ ایک پیکر کی تشکیل، تعمیر و تخلیق میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے اس لئے اس کا بالواسطہ تعلق باصرہ سے بھی ہے، ظاہر ہے کہ جب سامعہ اور باصرہ سے اس کے رشتے ہیں تو پھر لامسہ اور ذائقہ سے بھی اس کے گہرے روابط ہیں نیز شامہ پر بھی وہ بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ اس کا اپنا ایک جسم ہوتا ہے اور اس جسم میں اس کی اپنی ایک انفرادی خوشبو ہوتی ہے اس طرح لفظ حواس خمسہ سے

یوں دیکھیں تو انسانی ذہن بھی ایک خطہ ہے، سرسبز وشاداب، فراوانی حیات و جمال حیات سے لبریز ومعمور اور ایک نادیدہ دست مہرباں کے خنک وزرخیز سائے میں مچلتا ہوا یعنی اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَّیُحِبُّ الْجَمَال، پھر وہ دونوں سرزمینیں، ایک تو وہ جہاں انور شیخ پیدا ہوئے، جہاں ہیر، رانجھا کے انتظار میں دیدۂ دل فرش راہ کئے ہوئے ہے، دوسرے وہ جہاں جولیٹ، رومیو کے انتظار میں گھر کے دریچے میں کھڑی ہے، اس طرح کہ رومیو کی زبان سے بے اختیار نکلتا ہے، ''دریچہ مشرق ہے اور جولیٹ آفتاب ہے،، وہ سرزمین جہاں ہیر اپنی دل فریب اداؤں کے ساتھ رقص کرتی ہے اور رانجھا اپنا سب کچھ اس پر قربان کر دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حرف دل شعلہ عارض سے تراشا جاتا ہے جہاں عشق کا ذوق تماشا ہے بے حد بلند و پختہ، اور سرشاریوں کے حصار میں ہے۔ ان تمام ادبی زرخیزیوں کے علاوہ انور شیخ کا موضوع مذہبیات عالم ہے، ظاہر ہے کہ اسلام کی تخصیص تو ہے ہی، اس تناظر میں وہ ساری دنیا کو دیکھتے ہیں اور اپنے عارفانہ ذہن سے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ مذہبیاب عالم میں صنمیات کا ایک اہم مقام ہے، یہ کیفیت ان کے یہاں مضامین میں بھی ہے اور شعری پیکروں میں بھی ہے۔ میں اس ضمن میں رومی کے اس شعر کا ذکر کروں گا جس کی کیفیت انور شیخ کے یہاں اکثر و بیشتر پائی جاتی ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ انداز تشکیک نہیں ہے، خندۂ استہزا نہیں ہے، اس کی زیریں تہوں میں شکوے کی ایک لہر رواں ہے، انسان اشیاء اور واقعات کو اپنی عقل سے پہچانتا ہے، اس کے پاس کسی چیز کا آلۂ شناخت عقل ہی ہے جسے وہ ہر لمحہ بروئے کار لاتا ہے۔ انور شیخ نے اس میدان میں بھی مختلف پہلو نکالے ہیں، ان پر سیر حاصل بحث کی ہے، سوالات اٹھائے ہیں، جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان موضوعات پر بھی ہمارے مشاہیر علم وفن توجہ دیں اور انور شیخ کی اس فکری جہت کو دیکھیں کیونکہ انہوں نے جو کیا ہے وہ اس کے لئے ٹھوس دلائل رکھتے ہیں، براہین رکھتے ہیں، انہوں نے ہوائی قلعے تعمیر نہیں کئے ہیں جنہیں ایک تبسم زیر لب یا استہزا کے ساتھ نظر انداز کر دیا جائے۔ چونکہ میں اس شاہراہ کا مسافر نہیں ۔

مربوط ہوجاتا ہے اور اس طرح مشامی، ذوقی، سمعی، بصری اور لمسی پیکروں کی تخلیق ہوتی ہے۔
میں نے کچھ پہلے جن تحریروں کے حوالے دیئے ہیں ان میں جس انداز سے لفظ کی تقدیس و تحریم، اس کی عظمت و بزرگی پر اظہار خیال کیا گیا ہے، اس کی جہتوں کو جس انداز سے ابھارا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ انتہائی طاقت ور شے ہے، ایک پراسرار وجود اور اس پراسرار وجود کی تخلیق میں کام آنے والے عناصر کے سامنے مٹی، آگ، پانی، ہوا محض حقیر و ناتواں کیچوؤں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سب سے پہلے آواز تھی، آواز نے ہی لفظ کے پیکر کی تشکیل کی۔ لفظ کی تخلیق اول میں آواز کا گہرا دخل ہے، جب لفظ متشکل ہوا تو اس کی ادائیگی آواز کے ذریعہ ہی کی گئی، اس کی دو جہتیں تھیں، ایک تو اس کی شکل جو باصرہ سے تعلق رکھتی تھی کہ جب نقوش ایک مخصوص زاویے میں نمودار ہوتے تھے پھر وہ آواز جو الفاظ کا اعلامیہ بنتی تھی، بعد میں لفظوں کی نشست و برخاست لف ونشر نے مختلف روپ اختیار کئے جن سے تفہیم و ترسیل اور تبلیغ کی راہیں کھلیں یہی وجہ ہے کہ فنون لطیفہ میں شاعری کو مصوری اور موسیقی سے زیادہ بلند مقام حاصل ہے یعنی الفاظ کے اندر معنی کا بیکراں اور مواج سمندر چھپا رہتا ہے، شاعر اس کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے، اس طرح ایک ہی لفظ کئی طرح کے معنی اختیار کر لیتا ہے، قاموس و لغات کے صفحات میں الفاظ محدود ہیں لیکن شعر اپنی معنوی سطح میں کبھی محدود نہیں ہوتا، سارے شاعر الفاظ کی مدد سے ایک ہی وقت میں یا صدیوں سے شعر کی تشکیل و تخلیق کر رہے ہیں، انہیں الفاظ کے دروبست سے، نشست و برخاست سے، ترتیب و تزئین سے مصرعے ڈھل رہے ہیں، شعری پیکر نمودار ہو رہے ہیں لیکن معنی مختلف ہیں، موضوعات مختلف ہیں، ہزاروں سال سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اس میں کہیں سے کمی نہیں آتی، عصری تقاضوں کے تحت لفظ اپنے معنی بدل لیتا ہے۔ الفاظ لغات کی الماریوں میں بصد شکوہ متمکن ہیں، شاعروں کی نسلیں نمودار ہوتی ہیں اور ماضی کی گرد میں دفن ہو جاتی ہیں، نئے فنکار آجاتے ہیں، ان کے اپنے عصری تقاضے ہوتے ہیں، وہ بھی انہیں لفظوں کو اٹھاتے ہیں، استعمال کرتے ہیں جو ان کے پیش روؤں نے کئے ہوتے ہیں، نقوش بناتے ہیں، اس کے بعد گرد فنا میں دفن ہو جاتے ہیں، لیکن جب لفظوں کا استعمال ختم ہو جاتا ہے تو گریہ الفاظ کی آوازیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ لفظ خود میں مختلف المعنی ہوتا ہے اور لطف کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس شعر کے مطابق:

انگور میں یہ شئے تھی پانی کی چار بوندیں پر جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہوگئی ہے

(امیر مینائی)

بہر حال لفظ ایک پراسرار شئے ہے جس میں مطالعہ اور مکاشفہ تو ہے ہی معنی کا ایک جہان بسیط ہوتا ہے، زبان کوئی بھی ہو لفظ کے بطن میں معنی کا سرمایہ کم نہیں ہوتا بالکل اسی طرح جس طرح دیو پیکر سیاہ سحابوں کو سمندر اپنے وجود کا کچھ حصہ تفویض کر دیتا ہے اور وہ بلا امتیاز بلند و پست زمینوں کو سیراب کرتے رہتے ہیں۔ لفظ خود کسی زمانے کا پابند نہیں ہوتا ہاں زمانے اس کے پابند ضرور ہوتے ہیں۔ لفظ کی حکومت زمان و مکاں کی مملکتوں پر ہوتی ہے اور تمام طاقتیں اس کے وجود میں خیمہ زن ہوتی ہیں اس لئے محسوسات سے اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے، اسی سے پیکر بنتے ہیں، ان میں طرح طرح کے منظر ناموں کو تلاش کیا جا سکتا ہے جو ہمارے حواس کیلئے بیحد اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ اس بساط لا انتہا پر ہزاروں رنگوں کی قوس قزح بکھری پڑی ہے اور اس طرح لفظ اظہارات کے نئے نئے پیکر تراشتا ہے اور انسانی وجود کے گرد پھیلے ہوئے ہزاروں ماہ و سال کی تعبیر و تشریح کا فرض انجام دیتا ہے اور ہر لمحہ ایک نئی زندگی پر منتج ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں انور شیخ کے یہاں سے اس طرح کی مثالیں پیش کروں اور آپ کو حواسی پیکروں، رنگوں، طاقتوں اور ثروت مندیوں کا جلوہ دکھاؤں میں متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے سرمائے سے کچھ اشعار پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جن میں آپ جلال اسیر کے اس مصرعہ کا حسن دیکھیں گے ''زمیں زپر تو گل تا بہ آسماں شفق است'':

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

(مصحفی)

ہوگئے ہیں جمع اجزائے نگاہ آفتاب
ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

(غالب)

شاعری کا حواس کی کیفیتوں سے گہرا تعلق اسی لئے ہے کہ شعر نشاط و غم، وصل و ہجر، درد و لذت و مستی تمام چیزوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور بقول چارلس بودلیئر''، شاعر ایک آفاقی مترجم ہوتا ہے جو تمام اشیاء خصوصاً مظاہر فطرت کی زبان سمجھتا ہے اس سے کلام کرتا ہے، اس کے سخن شیریں کا ترجمہ کر کے ہم تک پہونچاتا ہے۔'' اس کی کیفیات میں مستقبل کی بشارتیں

بھی ہیں، حسن وعشق کی سرمستیاں بھی ہیں، فراق ووصل کے لمحے بھی ہیں جن سے شعر کا حسن نکھر آتا ہے، ظاہر ہے کہ ادب برائے حیات کا اصل مطلب یہی ہے مگر ہمارے یہاں ترقی پسند ادیبوں نے ادب برائے حیات کے معنی روزی اور روٹی اور مادی زندگی کے حصول تک محدود رکھے۔ شاعری وہی اعلیٰ ہے جو ادب برائے حیات ہو اور حیات سے انسانی زندگی کی مختلف ذہنی کیفیتوں کا اور ذہنی کیفیتوں میں حواس کی بڑی طاقتوں کا گہرا دخل ہے، یہی وجہ ہے کہ مصحفی اور غالب کے اشعار جو میں نے مثالاً پیش کئے ان میں مصحفی کے شعر میں بادِ نسیم کا سفر جرس غنچہ کی صدا پر ایک تو یہ کہ نسیم کے قدموں کی آہٹ کہ وہ محوِ سفر ہے پھر جرس غنچہ یعنی غنچے کے چٹکنے کی آواز ایک نغمگی، ایک ہی مصرعہ میں دو استماعی پیکر بن جاتے ہیں جو ہمارے سامعہ میں رس گھولتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں قافلۂ نوبہار کا مسلسل سفر، اس سفر میں ارباب قافلہ کے چلنے کی آوازیں بھی ہیں جو ایک سمعی نقش ہے لیکن باصرہ کو متاثر کرتا ہے، وہ منظر نامہ کہ قافلۂ نوبہار پورے شکوہ وشان کے ساتھ رواں ہے، غنچے چٹک رہے ہیں یعنی غنچوں کی آواز نہیں قافلے کی بانگ جرس ہے اور نسیم تعاقب میں چلی جارہی ہے، نشان منزل حالانکہ نظروں سے اوجھل ہیں مگر کہیں نہ کہیں ہیں ضرور جو باصرہ کی بساط پر انعکاس پذیر ہیں۔ غالب کے شعر میں باصرہ تو ہے ہی لامسہ کا بڑا حسن ہے، یعنی مسلسل آفتاب ٹکٹکی لگائے اس بت کافر ادا کے گھر کے روزن کو دیکھتا ہے، مسلسل دیکھنے سے بصری اور لمسی پیکروں کو استحکام ملتا ہے، پھر یہ کہ نگاہ آفتاب اپنے اجزا کو اس کے گھر کے روزن میں رکھ دیتی ہے، مقصد یہ ہے کہ اگر آفتاب غروب بھی ہو جائے تو بھی وہ روزن سے اس حسن بے مثال کا نظارہ کرتا رہے، غالب کا کہنا ہے کہ روزن میں چمکنے والی یہ چیزیں ذرات نہیں ہیں بلکہ اجزائے نگاہ آفتاب ہیں جو اس کے گھر کے روزن میں ہمہ وقت مسکن گزیں ہیں۔ غالب نے رشک کا مضمون کس حسن سے باندھا ہے، شاعر کس طرح اس کے گھر کے روزن سے اس کا نظارہ کرسکتا، یہ امتیاز خورشید جہاں تاب کو حاصل ہے، اردو کے شعرائے متوسطین میں فراق گورکھپوری اور کوثر جائسی کا مقام اہم ہے ان کے دو شعر بھی پیکریت، تمثیل اور حواسی رنگوں کے حوالے سے دیکھئے:

جو چھپ کے چاند ستاروں سے پاؤں دھرتا تھا
اسی کے نقش کف پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

(فراق)

بنا گئے ہیں وہ یوں ساز آرزو گھر کو کہ آج تک در و دیوار گنگناتے ہیں

(کوثر جائسی)

فراق کا شعر حواس کی تمام طاقتوں اور رنگوں کو متحرک کرتا ہے، محبوب کا شرم و حجاب کی انتہا تک ہونا کہ وہ چاند ستاروں سے بھی سامنا نہیں کرنا چاہتا، چاند ستاروں کا اجتماع ایک عظیم بصری پیکر ہے جو غالب کی زبان میں، ''رات تھا تاروں کا اک لشکر کھلا''، کی کیفیت رکھتا ہے اور اس انداز میں ہی ہمارے سامنے آتا ہے یعنی محبوب دن میں بھی باہر نہیں آتا، دن میں ہنگامہ ہائے حیات ہیں، آفتاب کی روشنی ہے، دیدار کے پیاسوں کی بھیڑ ہے اور تمام گہما گہمی ہے۔ رات پر سکون ہے، خاموش ہے، لیکن رات آتے ہی چاند تارے آجاتے ہیں، اب اسے چاند تاروں کے سامنے آنے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔ شاہنامہ فردوسی میں شاہ افراسیاب کی بیٹی منیزہ کے خوبصورت جسم کو سورج نے کبھی نہیں دیکھا تھا جس کا اظہار منیزہ نے اس وقت کیا جب اسے باہر میدان میں سر دربار لایا گیا:

منیزہ منم دخت افراسیاب برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب

(فردوسی)

لیکن فراق کا محبوب تو چاند ستاروں سے بھی شرماتا ہے اور رات میں بھی باہر آنا پسند نہیں کرتا اب شعر کو یوں دیکھیں، چلنا پھرنا زندگی کے تحرک کی علامت ہے اس لئے وہ اندھیرے میں چلتا ہے، چلنا اور قدموں کی آہٹ ایک استماعی پیکر ہے، قدموں کا زمین پر رکھنا ایک لمسی پیکر ہے، لیکن پر لطف بات یہ ہے کہ وہ جہاں پاؤں رکھتا ہے چراغ جل اٹھتے ہیں گویا چاند ستارے خود اس کے قدموں میں اسیر ہیں اسے خبر نہیں کہ اسے جن مظاہر فطرت سے حجاب ہے وہ سب اس کے قدموں میں موجود ہیں۔ یہ ماہ و نجوم صرف آسمان پر ہی نہیں اس اندھیرے میں بھی ہیں جہاں محبوب اپنے حجاب کی وجہ سے پناہ گیر تو ہے مگر چل پھر رہا ہے۔ فراق نے یوں بھی ایک شعر کہا تھا:

فرش میخانہ پہ جلتے چلے جاتے ہیں چراغ
دیدنی ہے تری آہستہ روی اے ساقی

کوثر جائسی کے شعر میں ایک بڑا سمعی پیکر تخلیق ہوتا ہے وہ (یعنی محبوب) گھر کو ساز آرزو بنا گیا ہے، ظاہر ہے کہ جب سارا گھر ساز آرزو کے پیکر میں ڈھل چکا ہے، در و دیوار سے نغمے پھوٹ رہے ہیں، ساز آرزو مسلسل اپنا کام کر رہا ہے، بام و در گنگنا رہے ہیں، خاص بات اس

شعر میں یہی ہے کہ محبوب کی نگاہ مہرباں جب گھر پر پڑی گھر ساز آرزو بن گیا، ذرہ ذرہ گنگنانے لگا، لمسی، بصری اور سمعی پیکروں کا ایک نقش ہے، پھر اس پر مستزاد ذائقہ ہے۔ ساز کی آواز دل خوش کن ہے، یہاں مشامی پیکر بھی موجود ہے یعنی وہ جس نے گھر کو ساز آرزو بنایا اس کی خوشبو در و دیوار میں رقص کر رہی ہے، گنگنا رہی ہے، اس کی موجودگی کا احساس دلا رہی ہے۔ اب متاخرین کے دو اہم شعر دیکھئے:

رات چپ ہے ہلکے ہلکے چپوؤں کے ساز پر
گونجتا ہے کوئی نغمہ بادبانوں میں کہیں

(محمد احمد رمز)

میں عندلیب ہوں لیکن الگ نوا ہے مری
چمن کو خاک نہ کردے سخن شرارہ مرا

(غلام مرتضیٰ راہی)

سمندر کی بے کراں سطح پر کشتیوں کا سفر جاری ہے یعنی کشتیاں کھلے ہوئے بیتاب پانیوں سے ہم آغوش ہیں۔ یہ ایک لمسی پیکر ہے، اس سفر میں چپوؤں کی آواز اہم ہے جو اجتماعی پیکر بناتی ہے، پھر بادمراد چونکہ بادبانوں کے عشق میں گرفتار ہے کشتیوں کو ساحل کی طرف لئے جا رہی ہے اس ہم آغوشی ہوا و بادبان سے نغمے ابھر رہے ہیں اور یہ بھی ایک سمعی فضا تخلیق کرتے ہیں۔ اس طرح یہ شعر بھی حواس کے متعدد پیکروں کی نشاندہی کرتا ہے۔ آخری شعر جس میں شاعر نے خود کو بلبل بتایا ہے جس کی نوا ایک مستحکم استماعی رابطہ ہے۔ عندلیب کے ساتھ نغمہ لازم و ملزوم ہے لیکن اس نغمے کے زیر اثر پھول نہیں کھلتے ہیں بلکہ یہ نغمہ چمن میں آگ لگا دیتا ہے، چمن جل کر راکھ ہو جاتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ شاعر کسی تباہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے چمن میں آگ لگانا بھی دراصل بہار کے فروغ پذیر ہونے کی علامت ہے یعنی بلبل آتش نوا نے اپنے نغموں سے آتش گل دہکا دی ہے لیکن یہ آتش گل تو چمن کو پھونکنے کا کام کر رہی ہے۔ شاعر نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اس کا سخن شرارہ بھی آتش گل ہے وہ خود عندلیب آتش نوا ہے، لیکن چمن کو خاک کر دینے کی کیفیت میں مزید شادابی اور تازگی کروٹیں لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

ان تمام مثالوں کے پیش کرنے سے اصل مقصد یہ تھا کہ انور شیخ کی غزل کی مختلف کیفیتوں کو ظاہر کر دیا جائے یا دیکھا جائے کہ حواسی پیکروں کی سطح پر ان کا شعر کیا کیا طلسم فاش

کرتا ہے کن کن جہانوں میں سفر کرتا ہے۔ لامسہ، شامہ، سامعہ، باصرہ اور ذائقہ یہ تمام کیفیات ان کے یہاں اس طرح نمودار ہوتی ہیں کہ ایک بڑا منظر نامہ طلوع ہوتا ہے۔ اس کائنات کے حسن و جمال، نشاط و غم سے ان حواسی رنگوں کا گہرا تعلق ہے۔ ہم سب کرہ ارض پر پیدا ہوئے ہیں، جذبات سے معمور دل رکھتے ہیں، ہماری رگوں میں جو خون رواں ہے اس میں ہماری مٹی کی خوشبو کروٹیں لیتی ہے۔ یہ خوشبو آتش زرنگار کی طرح روشن ہے اس لئے ہم ان حواسوں کی دولت سے مالا مال ہیں جو ہمیں ہر طرح کا لطف و ذائقہ فراہم کرتے ہیں۔ تلخ و شیریں حامض و حابس ہر ذائقہ ہماری مٹی میں موجود ہے اسی لئے جب ہم بات کرتے ہیں یا کوئی لفظ ہمارے دروازہ لب سے باہر آتا ہے تو کسی نہ کسی جذبے کا آئینہ دار ہوتا ہے اس میں ایک جھنکار ہوتی ہے جو ہمارے سامعہ کو لطف کا سامان فراہم کرتی ہے۔ ایک خوشبو ہوتی ہے جو ہمارے شامہ کو فرحت عطا کرتی ہے۔ ایک چھونے کی کیفیت ہوتی ہے جو ہمیں لمس کی لذت سے آشنا کرتی ہے۔ دید کا منظر نامہ ہوتا ہے جو براہ راست ہمارے باصرہ میں در آتا ہے۔ ہمارے لئے نشاط کا سامان بھی بنتا ہے، کرب کا غماز بھی ہوتا ہے۔ پیر رومی نے کیا خوب کہا ہے:

آدمی دید است باقی پوست است دید آں باشد کہ دید دوست است

ان تمام چیزوں میں ذائقہ بے حد اہمیت کا حامل ہے جو ہمیں اشیاء سے متعارف کراتا ہے، لطف و ابتہاج بھی دیتا ہے اور دل کے آسمانوں پر ایسے سحابوں کی تخلیق بھی کرتا ہے جو خون بن کر آنکھوں سے برستے ہیں یعنی ''آنکھوں سے خون روتے ہیں فصل بہار میں''۔ میر نے کہا ہے:

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا ہم تو سمجھے تھے کہ اے میرؔ یہ آزار گیا

اس شعر میں ایک مذوقی حس ہے جو پہلے باصرہ میں ڈھلی پھر اس نے ایک خاص ذائقہ فراہم کیا۔ انور شیخ کہتے ہیں:

چھپ گئی اپنی گرد راہ میں جو
کس طرح پاؤں گا میں وہ منزل

ہماری داستاں کی تلخیاں بھی کچھ نرالی ہیں
کہ ہر نوک زباں کو ایک نشیلی سی حلاوت دی

لطف گرنے میں بھی ہے شوق جو ہو اٹھنے کا
لہر جو گر کے اٹھی اور ہی اوپر وہ چڑھی

اسے دیتا ہے تو مالک جسے کچھ حق نہ لینے کا
سمندر پر تو ہو بارش مگر تپتا رہے صحرا

من کے تاروں میں چھپے سُر، جو انہیں بھی چھیڑیئے
ہائے یہ کیسا ترانہ ساز دل خاموش ہے

اس سے پہلے کہ انور شیخ کے ان شعروں میں حواس کی تمام تر کیفیتوں کو تلاش کیا جائے فرانسیسی شاعر چارلس بودلیئر کی یہ رائے بھی دیکھتے چلیں،

''شاعرانہ شخصیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس نہایت درجہ تاثرات پذیر اور ذکی الحس ہو جاتے ہیں، آنکھیں پردۂ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں، پرشور مقامات میں خفیف سے خفیف آواز کو کان سننے لگتے ہیں اور شور سے قطعی نا آشنا رہتے ہیں۔ اختلال خیالات واقع ہوتا ہے۔ جملہ اشیائے عالم اپنی صورت سے بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہو جاتی ہیں اور خیالات میں نا قابل حل اطلاقی تغیر پیدا ہوتا ہے۔ آوازیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں اور رنگ میں نغمہ پیدا ہو جاتا ہے۔''

گذشتہ سطور میں انور شیخ کے جو اشعار میں نے پیش کئے ہیں ان میں شعر اول میں گرد راہ پوری کائنات سفر کا احاطہ کئے ہوئے ہے جس میں چہرۂ منزل کے خدوخال چھپے ہوئے ہیں، حواس کی یہ وہ کیفیت ہے جہاں کا پرشکوہ منظر نامہ تو ہے ہی لیکن حواسی قوتیں چہرۂ منزل کا ادراک رکھتی ہیں اور انہیں کی مدد سے شاعر چہرۂ منزل کے خدوخال کی موجودگی کا احساس کرتا ہے یعنی گرد کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ہے مگر خدوخال منزل کی آوازیں مدھم ہی سہی لیکن شاعر کے طشت سماعت تک پہونچ رہی ہیں۔

شعر ثانی میں مذوقی طاقت جس انداز سے ابھر رہی ہے وہ منظر قابل دید ہے، داستاں، تلخیاں، نوک زباں، نشیلی، حلاوت یہ سارے الفاظ ایک شعر میں جمع ہیں اور پرشکوہ مذوقی پیکر

تخلیق کررہے ہیں۔ داستان میں الفاظ ہوتے ہیں جن کی ادائیگی میں ایک لطیف ذائقہ ہے۔ الفاظ کے ادا ہونے میں ہونٹوں کا اتصال ایک لمسی پیکر بناتا ہے، نوک زبان مختلف ذائقوں کا احساس کراتی ہے، تلخ بھی شیریں بھی حامض بھی اور کسیلے بھی۔ حلاوت کا تعلق بھی زبان سے ہے جو ہر اس شئے کے ذائقے کا اظہار کرتی ہے جو اس سے ہم آغوش ہوتا ہے خواہ وہ ذائقہ شیریں ہو یا نہ ہو۔ نشیلی لفظ سارے وجود پر مسلط ہے، نشیلی حلاوت صفت ہے داستان کی۔ داستان خود میں موصوف ہے۔ شاعر کا لہجہ خبری ہے وہ کہتا ہے کہ میری داستان کی تلخیوں میں بھی پوشیدہ ایک حلاوت ہے۔ ایسی حلاوت جو تمام وجود پر مسلط ومحیط ہے۔

تیسرے شعر میں زندگی کا تحرک ہے۔ موج کے زوال میں عروج کروٹیں لے رہا ہے یعنی اٹھنا پھر گرنا، گر کر اٹھنا گویا مزید بلندی تک جانا ہے، ارتقائی عمل سے دوچار ہوتا ہے اور ایک نیا تفاعل پیدا کرتا ہے۔ لہروں کا ایک عمودی منظر ہے جو اہراموں یا مینار بابل جیسی کیفیت اس بسیط منظر نامے میں پیش کرتا ہے۔ موج کا اٹھنا بہر حال ایک مرکزیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آخر موج کہاں سے اٹھی، بسیط وبیکراں سمندر کے بطن سے یعنی انسانی وجود سے، سمندر سے موج کی ہم رشتگی اور وابستگی ایک لمسی کیفیت کو ابھارتی ہے یعنی اپنے مرکز کی طرف لوٹ آنے کے بعد پھر موج جب دوبارہ اٹھتی ہے تو اس میں عزائم کی نئی آگ ہوتی ہے، شعر مکمل ترین باصرہ لامسہ اور سامعہ کا پیکر بناتا ہے کیونکہ موج کا گرنا پھر اٹھنا سامعہ میں ایک شور کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ شاید اسی تاثر کے سیاق وسباق میں غالب نے یوں کہا تھا:

بسان موج می بالم بہ طوفاں　　بشکل شعلہ می رقصم در آتش

چوتھے شعر کے مصرعۂ اول میں شاعر نے ایک شکوہ کیا جو اس کے اندر کہیں سے محرومی محزونی وشکستگی کی غمازی کرتا ہے کہ اے خدا تو اسی کو دیتا ہے جسے لینے کا کوئی حق نہیں حالانکہ دینا اور لینا یہ دو عوامل ہماری زندگی میں جہاں کہیں ہیں لمسی پیکروں کی تخلیق کرتے ہیں لیکن سحابوں کا صحرا پر نہ برسنا سمندر پر برسنا ہر چند کہ لمسی اور سمعی نیز بصری پیکروں کا غماز ہے لیکن بے حد اہمیت کا حامل۔ یہاں یہ شعر یاد آتا ہے:

سمندروں پہ برسنا کوئی برسنا ہے
برس ہماری طرف ریگزار ہم بھی ہیں

(مظفر حنفی)

یا پھر بیدلؔ نے اپنے شعر میں واضح طور پر بتایا ہے کہ سحاب کرم کہاں برستا ہے کہاں نہیں برستا، کسے سیراب کرتا ہے اور کس کی آتش تشنگی کو مہمیز کرتا ہے:

از سبزہ تا نہال جگر تشنہ اند، لیک بر رشحہ سحاب کرم اختیار کیست

برستے ہوئے بادلوں کی اس امتیازی کیفیت تفریق آمیز کا شکوہ ہوتا رہا ہے لیکن بہر حال اس میں بھی کچھ راز پنہاں ہوتے ہیں۔ مظفر حنفی نے تو صاف کہہ دیا کہ سمندر پر برس کر ابر خود کو ضائع کرتا ہے، اگر یہ ابر ریگزار پر برسے تو ذرات سیراب بھی ہوں اور ابر کی فیاضی بھی ظاہر ہو۔ صحرا پر برسنے سے اس کا امکان بھی ہے کہ قوت نمو فروغ پذیر ہو اور چاروں طرف پھول ہی پھول نظر آنے لگیں اور صحرا کی قلب ماہیت ہو جائے یعنی وہ گلشن میں تبدیل ہو جائے۔ ممکن ہے کہ سحاب صحرا کی قلب ماہیت سے دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ بیدل نے تو واضح طور پر یہ کہہ دیا کہ سبزہ بھی ہے اور پیاس سے بے حال نہالان خوردسال بھی جگر تشنہ ہیں۔ یہ سب صحیح ہے لیکن رشحہ سحاب کرم یعنی لکہ ابر یا پارۂ ابر کس کے اختیار میں ہے، کس کی ہمت ہے کہ وہ اس سے فیض حاصل کرے تاوقتیکہ وہ کسی کو فیض نہ پہونچانا چاہے۔ غالب نے اس مضمون میں الگ تھلگ پہلو نکالا ہے۔ وہ سحاب کرم کے مرہون منت نہیں ہیں اور صحرا کو چمن زار بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں:

آغشتہ ایم ہر سر خارے بہ خون دل قانون باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

(غالب)

وہ ہر کانٹے کو خون دل دے رہے ہیں گویا کہ قانون باغبانی صحرا رقم کر رہے ہیں، سحاب کی ضرورت نہیں، خون دل میں نمو کا مواج سمندر موجود ہے، سحاب کرم کی بے اعتنائی کے تناظر میں یہ شعر بھی اہم ہے:

جسے چاہے مالک رنگ و بو اسی بے رخی میں نواز دے
میں ادھر تھا منتظر کرم وہ نگاہ ناز ادھر پڑی

(نشور واحدی)

بہر حال ان سارے اشعار میں حواسی پیکروں کے جلوے میں موجود ہیں جن کا اظہار مختلف انداز سے شعرا نے کیا ہے اور انور شیخ کے آخری شعر میں بھی ساز دل خاموش ہے کی کیفیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ساز خاموش ہے مگر اس کا نغمہ گونج رہا ہے جس کو سامعہ محسوس کرتا ہے یعنی شور نہیں ہے یعنی نغمے کی آواز نہیں ہے لیکن اس کی تصویر موجود ہے، ٹھیک اسی طرح:

آئینۂ آواز میں چمکا کوئی منظر تصویر سا اک شور مرے کان میں آیا

(ظفر اقبال)

یعنی وہ کون ہے جو من کے تاروں کے اندر چھپے ہوئے سروں کو چھیڑ رہا ہے ظاہر ہے کہ ساز پر انگلیاں مضراب کا کام کرتی ہیں اور انگلیوں کے ساتھ لمسی پیکروں کا گہرا رشتہ ہے۔ اس سطح پر اگر اس شعر کا مطالعہ کریں تو بہت سی جہتیں ابھرتی ہیں۔

میں یہ کہنے میں کچھ باک محسوس نہیں کرتا کہ یہ پنج رنگی حواس ہماری زندگی میں عظیم الشان کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کا تعلق ہمارے جذبات نشاط و غم سے ہے۔ باصرہ دیکھتا ہے کسی شئے کو، انسان واقعہ سے متاثر ہوتا ہے، اس کے اندر لامسہ اور ذائقہ بھی ہوتے ہیں کہ دیکھنے سے ہم پر کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ ذائقہ ہے، نگاہ جس شئے کو دیکھتی ہے جس شئے کو چھوتی ہے باصرہ ہمیں کئی انداز سے مشتعل بھی کرتا ہے۔ اشتعال منفی بھی ہوتا ہے مثبت بھی، لامسہ بھی ہمیں مشتعل کرتا ہے، مثبت اور منفی دونوں طریقوں سے، شامہ اور سامعہ بھی ہمیں مشتعل کرتے ہیں۔ نغمے کی مستی ہمارے خون میں لذت انگیز اشتعال پیدا کرتی ہے۔ پھول کی خوشبو بھی ہمارے جذبات کو متحرک کرتی ہے برانگیختہ کرتی ہے۔ اس رنگ میں صنف نازک کے جسم کا خاص مقام ہے۔ آواز کی جھنکار، جسم کی خوشبو، ترشا ہوا جسم، پھر اس کو چھو کر مستی کا احساس لمس کے انتہائی لمحوں میں لذت کا نقطۂ عروج غیر فانی ذائقے کا سراغ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام فنون لطیفہ کا انحصار حواس کے رنگوں پر ہے۔ حواسوں کا بڑا کردار ہے یہی وجہ ہے کہ ہم جن چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اعضائے جسم کے توسط سے چھوتے ہیں، سونگھتے ہیں، سنتے ہیں یا اس کا ذائقہ محسوس کرتے ہیں یعنی اسے چکھتے ہیں، اس سے متاثر ہوتے ہیں، کئی تجربات جو ہمارے اپنے نہیں ہوتے ہم پر کم اثر کرتے ہیں مگر ان تجربوں کے عمل سے گزرنے کی بیتابی ہماری مٹی میں کہیں نہ کہیں کروٹیں لے رہی ہوتی ہے۔ یہ حواسی رنگ ہی ہیں جو ہمارے اندرون میں تشنگی پیدا کرتے ہیں۔ کبھی سرابوں کا سلسلہ قائم کر دیتے ہیں کبھی خنک چشموں کے تحفے نچھاور کر دیتے ہیں۔ ہم ان اجنبی دیاروں کی سیر کرنا چاہتے ہیں جہاں ہم کبھی نہیں گئے ہوں۔ ان مملکتوں کی فتوحات کے متمنی ہوتے ہیں جن پر اب تک فاتحین کے نقوش قدم ثبت نہیں ہوئے ہیں۔ یہ سارا طلسم ہمارے احساسات کے رنگوں کا ہے جو ہمیں مختلف لذتوں اور جہتوں سے ہمکنار کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاعری ان تمام جذبات

ہوں اس لئے توجہ تو مبذول کرا سکتا ہوں مگر حتمی طور پر کچھ کہنے کا یارا نہیں پاتا ہوں مگر شاعرانہ افکار کے تعلق سے میری بات جاری رہے گی اور اس راہ میں جو بھی آئے گا میں اس پر کلام کرتا رہوں گا کیونکہ یہ سفر میرے لئے دلچسپ ہے، یہ سیاحت میرے لئے مستی و رعنائی سے بھرپور ہے، ایسا نہیں ہے کہ میں مساحت راہ کا عمل انجام دے رہا ہوں بلکہ سیر حاصل گفتگو کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔ اس سیاحی کے دوران جو مناظر میرے سامنے آئیں گے ان کے اسرار و غوامض بھی حتی المقدور منکشف کرنے کی سعی کروں گا۔ اگر میں اصناف ادب میں انور شیخ کی فکر جہاں تاب سے طلوع ہونے والی ایجادات کی بات کروں تو میں یہ عرض کروں گا کہ قدیم ادبیات ہی وہ زمین ہے کہ جس میں تہہ در تہہ خزانے پوشیدہ ہیں، اب بات صرف ان تہوں کو اُلٹنے کی ہے اس لئے جو انمرد وہی ہے جو ہمت سے کام لے اور سانپ کو مار کر گنجینۂ زر حاصل کرے اس لئے یہ عمل بیلچہ اٹھا کر تہیں الٹنے کا ہے، ہر تہہ میں ایک خزانہ پوشیدہ ہے۔

اصناف ادب کی ایجادات کا سلسلہ تو ہر دور میں جاری رہا ہے لیکن چند ہی اہل دانش و تفکر اس کام کو انجام دے سکے ہیں۔ اصناف سخن کا وجود میں آنا، ان کا معانی و مفاہیم پر محیط ہونا اہم ہوتا ہے پھر وہ کس انداز سے رد و قبول کی منزلوں سے گزرتی ہیں، اس دشت میں یہ سارے مصائب موجود ہوتے ہیں جو بیحد اہمیت کے حامل ہیں، ایجادات انسانی تمدن سے ہم رشتہ ہیں، ان کی تاریخ بسیط ہے، پراسرار ہے، دلچسپ ہے، تنوعات سے لبریز ہے اور اس میں خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ، خود رند بلاکش والی کیفیت کا ہونا ضروری ہے۔

ان ایجادات کو دیکھیں تو انور شیخ کے خوش رنگ سبزۂ فکر کی چہچہاہٹ بساط سماعت پر تراوش کرتی ہے، ان کے مطالعے کی وسعتوں کا احساس ہوتا ہے، ان اعماق کا سراغ ملتا ہے جن میں ان کا سفر جاری ہے، ان میں پنجاب کی سرزمین کو بیحد اہمیت حاصل ہے، وہاں کے لوک گیتوں اور کلاسیکی شعرا کا رنگ نمایاں ہے، عالمی سطح پر محیط ادب اور فارسی عربی انگریزی کے اساطین ادب و فلسفہ کے افکار کی روشنی اور جودت طبع کا احساس ہوتا ہے اور شاعر کے نخل فکر میں جو اثمار شیریں پیدا ہوئے ہیں انہیں دیکھ کر بے اختیار صائبؔ کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

صائبؔ بہ کش از چہرۂ معنی ورق لفظ
تا کے زبروں سیر کنم باغ ارم را

کی ترجمان ہوتی ہے۔ اور پھر غزل جس کا محور بھی یہی ہے اور نقطۂ ارتکاز بھی یہی ہے انسانی جذبہ پورے یقین، واعتماد کے ساتھ زندگی کی تمام شاہراہوں پر نئے نئے سنگ میلوں کی تنصیب کرتا ہے، فاصلوں کی پیمائش ہوتی ہے اور یہ رنگ ہمیں ان جزیروں کی طرف بہالے جاتے ہیں جہاں ایک طلسمی سماں ہوتا ہے۔

رشتوں کی باریکیاں بھی حواس کے انہیں رنگوں سے وابستہ ہیں حالانکہ ان میں سے بعض تارِ عنکبوت کی طرح ہوتے ہیں لیکن رشتوں کی لذت خود میں ایک ریشمی جال ہے، ایک خوبصورت کمند ہے، جس میں اسیری کا خواہش مند انسان ہوتا ہے۔

انور شیخ نے رشتوں سے متعلق مختلف انداز کے اشعار کہے ہیں جن میں حواسی رنگوں کی لہلہاہٹ اور کھلاوٹ بنیادی طور پر حد سے سوا نظر آتی ہے انہوں نے خود اپنے نظریات شاعری سے متعلق مختلف مقامات پر کچھ اس انداز سے گفتگو کی ہے:

> ''شاعری کیا ہے ایک ملکہ خداداد ہے، جس کی تعریف کرنا قیاس آرائی سے زیادہ نہیں، یہ وہ گانٹھ ہے جو کھولنے سے اور زیادہ گنجلک ہو جاتی ہے بایں ہمہ شاعری کی کیفیت وہی ہے جو ایک راز کی ہوتی ہے جو جتنا گہرا ہو اُسے جاننے کیلئے دل اتنا ہی مچلتا ہے۔''

اپنی کتاب ''نبض جہاں'' کے طویل و مبسوط پیش لفظ میں انہوں نے شعر سے متعلق بہت دلچسپ اور معنی خیز باتیں کہی ہیں جس سے ان کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے حالانکہ وہ تمام اصناف سخن میں اپنے قاری پر طرح طرح سے منکشف ہوتے ہیں لیکن غزل کا مکاشفہ اور ہی چیز ہے۔ شاعر سے متعلق ان کا خیال یہ ہے:

> ''شاعر ایک ایسا انسان ہے جسے قدرت سیمابی دل بخشتی ہے۔ جو حسن کی تلاش میں ہر لحظہ بیقرار رہتا ہے اس طرح بے ساختگی اور جذباتی بہاؤ اس کی فطرت کا حصہ بن جاتے ہیں اور اس میں صبر و انتظار کا عنصر کم ہونے لگتا ہے۔ نہ تو وہ سیاست داں ہے جو حکمت عملی کو اپنا پیشہ سمجھتا ہے نہ ہی وہ سپاہی ہے جو مقابلہ آرائی کو اپنی عظمت خیال کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کا دل اس کے قابو میں نہیں بلکہ وہ اپنے دل کے قابو میں ہے جو سیمابی کیفیت کے باعث اپنی دھڑکنوں

کی ہم آہنگی کھو بیٹھتا ہے اور اسے سلامتی کا راز وصال یار کے سوا کسی اور چیز میں نظر نہیں آتا۔''

اس طرح کی بیتابی کا جلوہ انور شیخ کے یہاں ان اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے:

کیا زباں تجھ کو ملی خالق ہستی سے صنم
کچھ کہو، سن کے اسے دل کبھی ناشاد نہیں

میری زندگانی کا اصل جو مزا تو ہے
جس سے ہر نفس مہکے وہ صنم نشہ تو ہے

کیا ہوا جان تمنا میں نہ تجھ کو پا سکا
تیری یادوں سے ابھی تک ہر نفس ہے مشک بو

میرے بخت کی جانم کیسی داستاں تم ہو
بن گیا فلک دشمن جب سے مہرباں تم ہو

اے مہ لقا شیریں ادا ناز آفریں رشک چمن
کیا معجزہ، تجھ میں سمٹ آیا جہاں کا بانکپن

ان اشعار میں ایک ایسا شاعر ہے جس کا سیماب وش مزاج ہر لفظ سے چھلک رہا ہے وہ بے قرار دل جو سینے میں ہے کیا کیا رنگ دکھاتا ہے، کیا کیا پیرایہ اظہار پیش کرتا ہے، کس کس طرح وہ شاعر کو فریب دیتا ہے اور شاعر دل کے ہاتھوں مجبور، جان کر بھی یہ فریب گوارا کرتا ہے کیونکہ بقول مومن:

دشنام دوست طبع حزیں پر گراں نہیں اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

اس میں شک نہیں کہ یہ تمام تر سیماب وشی دراصل حواس کے ان رنگوں کا کمال ہے جو شاعر کی خاک میں مسکن گزیں ہے اس کا وجود ان رنگوں کا ایک آمیزہ ہے، اس کی مملکت وجود کو جس قوس قزح نے، جس کہکشاں نے بنات النعش گردوں کی طرح حصار میں لے رکھا ہے اس کے تار و پود حواس کے ان تپتے ہوئے تمازت خیز اور حرارت آمیز رنگوں سے ہی مملو ہیں۔

***

انور شیخ کی غزل میں صنف نازک کی سحر انگیزی

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

(بیدل)

محسوسات کی عظیم تر قوتیں چونکہ اس کائنات کی تمام تر اشیاء جامد و ساکن، زندہ و متحرک میں موجزن ہیں اس لئے شادابی و تازگی کی فصلیں چاروں طرف لہلہاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ الفاظ ان اشیاء کی شکلیں محض مرتب کرتے ہیں، اظہارات کے بلند ترین کشادہ اور وسیع دریچوں کو کھولتے ہیں اس لئے ایک بسیط منظر نامہ بن جاتا ہے۔ بیدل کے اس شعر میں صنف نازک کے وجود میں لمس کی جس آگ کا ذکر کیا گیا ہے اس سے جاوداں بہاروں کا پتہ چلتا ہے اور نمو کا بیکراں خزانہ جو اس لذت خیز وجود میں مخفی ہے کوئی بھی طاقت کہیں سے اسے منہا نہیں کر سکتی اس لئے شاعر اپنا سرمایہ بہار اس کے سپرد کر رہا ہے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ پھول شاخ سے کہیں زیادہ تازہ و شاداب اس کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ شاخ میں تو پھول کھلتا ہے پھر ایک مخصوص و محدود مدت میں مرجھا جاتا ہے، زرد پڑ جاتا ہے یہاں تک کہ اس کی پنکھڑیاں بکھر جاتی ہیں، ہوائیں انہیں ان جہانوں میں لے جاتی ہیں جہاں سے وہ کبھی واپس نہیں آتیں۔ یہ سب کچھ شاخ کی رگوں میں تیرنے والی آگ کے مدھم پڑ جانے سے ہی ہوتا ہے اور اس موسم کے زیر اثر بھی جس نے اس پھول کو کھلایا ہوتا ہے لیکن پھول یعنی سرمایہ بہار جس کے سپرد کیا جا رہا ہے وہ موسم کی زد میں نہیں ہے بلکہ تمام موسم خود اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔

فنون لطیفہ میں عورت کی بے حد اہمیت رہی ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ اس کائنات کا ایک عظیم و لطیف شہکار ہے۔ بعضوں نے تو تخلیق کائنات کا سبب عورت کو ہی ٹھہرایا ہے اور اس کی تعریف بے حد کرنے کے بعد اس باب کو یہ کہکر بند کر دیا ہے کہ مظاہر فطرت سے

اس کے حسن کی مثالیں نہیں دی جاسکتیں کیونکہ اس کی یکتائی مثالوں سے رسوا ہوتی ہے اس لئے اس کے لب وعارض کو غنچہ وگل کہنا دراصل غنچہ وگل کے مرتبے کو فزوں کرنا اور لب وعارض کی حیثیت کو کمتر کرنا ہوتا ہے۔ بعضوں نے کہا کہ نسوانی جمال الفاظ کے سانچے میں ڈھل ہی نہیں سکتا اس لئے کچھ کہنا اس کی توہین ہے۔ بیش بہا رنگ بھی اس کے جمال دلفروز کی تاب نہیں لا سکتے اس لئے جو تصویر بننی چاہئے وہ تصویر نہیں بن سکتی۔ کوئی بھی مصور لب ورخسار بنا سکتا ہے لیکن وہ آواز نہیں بنا سکتا جس میں شعلہ لپکتا رہتا ہے لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ پھر اس کی تعریف کس طرح کی جائے اس نکتۂ نظر سے دیکھیں تو کائنات کا تمام حسن اس کے جمال کے سامنے کمتر ہے۔ حسن کے مزاج شناسوں کی مشکل یہی ہے کہ وہ جو کچھ دیکھیں گے اس کی تعریف پر مجبور ہونگے۔ ان اشیاء کا ذکر کریں گے جو اس تنگ نائے کائنات میں موجود ہیں اور پھر ''کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے'' کہکر خاموش ہو جائیں گے کہ اس کے آگے ان کی دسترس نہیں لیکن یہ کہنا کہ الفاظ حسن کی تعریف میں عاجز نظر آتے ہیں ایسا نہیں ہے۔ ہمارے پاس یہی پیرایۂ اظہار ہے لفظوں کے سوا اور سرمایہ ہے بھی کیا۔ لفظ ساحر ہیں، لفظ طلسم شکن ہیں، لفظ فاتح ہیں اور تخلیق کار کی تحویل میں الفاظ بڑی حد تک مفتوح ہیں۔ لفظ فاصلے بڑھاتے بھی ہیں کم بھی کرتے ہیں۔ فضا میں بے حد تاریکی پیدا کر سکتے ہیں، ہزاروں کائناتوں کو منور اور درخشاں کر سکتے ہیں، فلک شگاف قہقہوں کی تخلیق کر سکتے ہیں، آنسوؤں کی بارش سے فضا کو نم کر سکتے ہیں، فلک شگاف آواز گریہ سے شش جہات کو متزلزل بھی کر سکتے ہیں۔ اسلئے وہ صنف نازک کے حسن بے مثال کی تعریف کا حق ادا کر سکتے ہیں لیکن عبدالحمید عدم نے یہ چار مصرعہ کہکر گویا عورت کی تعریف پر ایک مہر لگادی ہے:

طاقتیں صرف دو ہیں دنیا میں
جن سے سارا نظام جاری ہے
اک خدا کا وجود برحق ہے
ایک عورت کی ذات باری ہے

چوتھے مصرعہ میں عورت کے لئے ''ذات باری'' کی ترکیب بے حد معنی خیز ہے اور اس عمل تخلیق کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے صرف عورت ہی انجام دے سکتی ہے۔

انور شیخ کی غزل میں عورت ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی شاعری اسی کے گرد گھومتی ہے انہوں نے اپنی ایجاد کردہ اصناف سخن میں عورت کا خوب ذکر کیا ہے لیکن محض یوں نہیں کہ وہ وفا کا پیکر ہے، حسن کا پیکر ہے، انور شیخ کی خوبی یہ ہے وہ جس کردار سے متعلق گفتگو کرتے ہیں اس کی تمام مثبت و منفی تصویریں ہمیں دکھاتے ہیں۔ ان کے یہاں عصری شعور بے حد عمیق و توانا ہے اس لئے وہ تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں، وہ جذبات کی رو میں اس قدر نہیں بہتے کہ ان کے دریائے فکر کا شفاف پانی گدلا ہو جائے اور پھر اس میں کوئی منظر نظر ہی نہ آئے۔ وہ تخلیقی عمل کی انتہا تک جاتے ہیں، اپنے مخصوص انداز میں جذبے کو بیان کرتے ہیں۔ ان بیانات میں خندۂ زیر لب بھی ہے، فلک شگاف قہقہے بھی ہیں، طنز بھی ہے اور مزاح کے پہلو بھی۔ ان باتوں کا تمام ذکر تفصیل سے آگے اس کتاب میں آئے گا۔ غور کرنے کی ضرورت یہ ہے کہ ان کے یہاں صنف نازک کی کیا کیفیت ہے؟ اس کے وجود کی کیا تہیں ہیں؟ اس کی نفسیات کیا ہے؟ اس کا سراپا کن رنگوں سے تخلیق ہوا ہے؟

عالمی ادب ہو یا انسانی زندگی کی کوئی بھی سطح ہو، مدنی زندگی کا نقشہ ہو اس کی اقدار ہوں یا دیہی زندگی کی سادگی ہو، عورت ہر منظر میں کارفرما ہے۔ شاعری، مصوری، سنگ تراشی تمام مرحلوں میں عورت کا ایک خاص مقام ہے۔ گویا یہ ایک آفاقی موضوع سخن ہے جسے بیحد برتا گیا اور اب تک کہیں سے بھی تھکن کے آثار نمودار نہیں ہوتے۔ وجہ اس کی صاف ہے کہ صنف نازک کا لمس حقیقی شاید اس قدر لذت انگیز نہیں ہے جیسا کہ اس کا تصور، بے حد لطیف و شیریں، خوبصورت، دلکش، رعنائیوں سے لبریز و سحر انگیز، اس کی خوبصورت تصویر ہر چند کہ بول نہیں سکتی، مرمریں مجسمہ اگرچہ متحرک نہیں ہے لیکن ان رنگوں میں بھی گرمی ہے، اس پتھر میں بھی گداز ہے، ایسا کیوں؟ میرے خیال سے خاص وجہ یہ ہے کہ ہم اس کے لمس سے آشنا ہوتے ہیں، متعارف ہوتے ہیں، جب بھی ہم اس کو دیکھتے ہیں یا تصویر دیکھتے ہیں اس گداز کا نشہ اپنے آپ طاری ہوتا ہے اور وہی لمس بیدار ہو کر آنکھیں کھول دیتا ہے۔

انور شیخ مزاجاً حسن پرست ہیں، عورت پرست نہیں۔ ان کے اعصاب پر عورت سوار نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اسے اس کے کردار کے آئینے میں مثبت و منفی عکس دکھاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر جہاں کہیں نظم یا نثر میں لکھا ہے اس سے ان کے مزاج شناس

حسن و جمال ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ مثالیں ان کی نثری تحریروں سے دوں گا پھر غزل کے حوالے سے بات کروں گا۔ انور شیخ نے اپنی شعری کتاب نبض جہاں کے دیباچے میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ صنف نازک سے متعلق رقم طراز ہیں:

''شاعری کی اصل کشش عورت کا نفسیاتی خاصہ ہے، یہ ایک ایسا موضوع ہے جسے سمجھنے کیلئے حیات خضر بھی کافی نہیں ہے، دانشوروں کو خیال آرائی کرتے ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں لیکن وہ ابھی تک نسوانی معمہ کا حل تلاش نہیں کر سکے غالباً یہ گہرائی اتھاہ ہے جسے پانا ممکن ہی نہیں وہ اس لئے کہ عورت طبعی نزاکت کا ایک قدرتی مجسمہ ہے اس کی بقا کا انحصار عمل پیچیدگی پر ہے، جس کا اقرار انکار کا ترجمان ہو، جس کی ''نا'' کا مفہوم ''ہاں'' ہو، جو نمائش کا خواہاں ہونے کے باوجود اخفا، رمز و کنایہ کو اسلوب زندگی سمجھتی ہو اور جس کا عشوہ و غمزہ تیر و تفنگ کی حیثیت رکھتا ہو اسے کوئی کس طرح جان سکتا ہے۔''

اس مضمون میں حسن سے متعلق انہوں نے کس مبسوط و وقیع انداز میں اظہار خیال کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سوچ کے پہلو کس قدر عمیق و بسیط اور لازوال ہیں۔ وہ بتانا چاہتے ہیں کہ محبت میں دونوں کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں خواہ ادائے دلبرانہ کے ساتھ ''نا'' کہہ دیا جائے یا مسکرا کر ''ہاں'' کہہ دیا جائے۔ ان کی ایک اور تحریر دیکھئے:

''حسن مجازی ناپائیدار ہے، ایک کلی جب پھول بنتی ہے تو اس کی سندرتا دوبالا ہو جاتی ہے لیکن یہ سندرتا گل شبو سے کچھ زیادہ نہیں جس کی شگفتگی مہک اور تازگی عارضی ہوتی ہے، انسان جسے کاملیت کی تلاش ہے حسن حقیقی کے تجسس میں بیتاب ہو جاتا ہے اور رموز مجازی کی تہہ تک پہونچنے کے لئے اس طرح تگ و دو کرتا ہے جیسے ایک جہاز راں دوربین کے ذریعہ دھندلی فضا کا سینہ چیر کر اپنی بینائی کی وسعت کو بڑھانا چاہتا ہے۔ صوفیا کا کلام اس حقیقت لازوال کا متلاشی ہے وہ اس کے لئے اسی زبان کا استعمال کرتے ہیں، وہ رنگ و نور،

نازو ندرت، آہ و نالہ اور عہد وفا سے لبریز ہوتی ہے۔"

انور شیخ کی تحریروں میں حسن کے اقسام کا جس انداز سے بیان ہوا ہے وہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اختر شیرانی نے بھی کہا تھا کہ "گل شبو ہے تو اور تیری نکہت رات بھر کی ہے" ظاہر ہے کہ اس کائنات میں حسن کا قافلہ لمحاتی ہے، اس سلسلہ میں فراق کا یہ شعر قابل توجہ ہے:

ظلمت سرائے دہر میں کچھ روشنی تو ہے
اک رات کاروانِ عدم کا قیام دیکھ

لیکن اس ظلمت سرائے دہر میں جہاں ایک رات کاروان عدم کا قیام ہے، زہرہ اور افرودیتی کے حسن و جمال کے شاہکار بھی موجود ہیں۔ حسن مجازی ناپائیدار ہے لیکن ایک شعلۂ جوالہ ہے، ایک پرکالۂ آتشیں جس کے سامنے شاہوں کے تاج ٹھیکروں سے بھی بدتر اور کمتر نظر آتے ہیں۔ انور شیخ کے کلام میں یہی خوبی ہے کہ انہوں نے "عنبتان پریزاد" کی ایسی ایسی تصویریں پیش کی ہیں کہ جن کو فرشتے خراج پیش کرتے ہیں، جن کے سامنے زہاد کے عماموں اور شہنشاہوں کے زرنگار تاجوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے، بات جسم کے حوالے سے ہو آگ کے حوالے سے ہو، بوسے کا ذکر ہو کہ دست حنائی کا تذکرہ ہر مقام پر انہوں نے ایک انفرادی نقطۂ نظر پیش کیا ہے:

زہر بھی قند ہے قسمت سے اگر ہم کو ملے
اصل تاثیر تو گلرنگ ترے ہاتھ میں ہے

کہو تو اٹھائے گی وہ بوجھ کیا
کمر جس میں چلنے سے پڑتے ہوں بل

مری ناہید بھی تم ہو مری خورشید بھی تم ہو
میں اندھیری سحر ہوں بولئے کچھ اور کہنا ہے

جب ترے ہونٹوں سے پی تو بڑھ گئی تشنہ لبی
تو نے جب دل کی کہی تو بڑھ گئی تشنہ لبی

یعنی محبوب کے ہاتھوں میں زہر بھی قند بھی ہو جاتا ہے وہ زہر جو وجود کی تقدیر بن چکا ہوتا ہے اسے شیریں لبوں کی حلاوت قند کر دیتی ہے۔ قند ایک مٹھاس ہے ایک ذائقہ ہے جو روح میں غیر فانی شراب بن کر اتر جاتا ہے اور جب شاعر نے یہ کہہ دیا کہ اصل تاثر تو ''گلرنگ تیرے ہاتھ میں ہے'' اس سے صاف ظاہر ہوا کہ ''گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند''۔ اردو شاعری کی روایت میں سم کا تریاق ہونا، زہر کا قند ہونا اور شراب ہونا ایک عام سی بات ہے اور یہ اس عشوہ طراز کے دست ناز کے لمس شیریں وشگفتہ کا کمال ہے کہ وہ کس طرح زہر کو قند میں تبدیل کر دیتا ہے:

یہ راز لمس ترا دست ناز ہی جانے
شراب ناب ہے کیا چیز اور سم کیا ہے

(ندرت کانپوری)

کمر کا پتلا ہونا یعنی کمر پتلی صراحی دار گردن،، کی اصطلاح ہمارے یہاں اردو غزل میں رائج ہے جہاں محبوب سے چھیڑ چھاڑ اختلاط کی گفتگو ہوتی ہے، جوہی کے پھول کا سر پر رکھا جانا اور اس سے کمر کا لچک جانا یہ بھی نزاکت کا ایک عمل ہے:

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے بھی ہیں تو کیا
پاس آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

(غالب)

دراصل یہ سب خیال وخواب کی باتیں ہیں، ایسی عورتیں ہوتی ہیں، ہوتی تھیں، آج مرد کے شانہ بہ شانہ آ کر زنان خوش اندام خود کو بے حد توانا اور مضبوط سمجھتی ہیں مگر بقول انور شیخ عورت کی نفسیات کچھ اور ہی شئے ہے اور وہ کہیں بھی کسی عالم میں بھی ہو خلوت میں سپردگی کا عالم بس عورت عورت ہی ہوتی ہے اسے اسی زاویے سے دیکھا جانا چاہئے، اقدار بدلتی ہیں، تہذیبوں میں تصادم ہوتا ہے، آویزش کے لمحے آتے ہیں لیکن نفسیات تبدیل نہیں ہوتی۔ صنف نازک کو جن بنیادوں پر تخلیق کیا گیا ہے وہ وہیں پر ہے اور وہیں رہے گی۔ عاشق اسے ناہید اور خورشید کہکر اس کی شان دوبالا کہتا ہے، خود کو اندھیری سحر کہتا ہے جس کے اندر پوشیدہ ایک طنز بھی ہے۔ یہ ٹکڑا کہ ''بولئے کچھ اور کہنا ہے'' طنز کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن

ناہید جیسا روشن ستارہ جس کی روشنی میں حرارت آمیز خنکی ہے، طمانیت ہے، اور خورشید جو بیحد گرم اور تمازت کا پیکر ہے دونوں سے تشبیہ دینا نہایت ہی اہم بات ہے۔ اس شعر میں ناہید اور خورشید علامتیں بن گئے ہیں محبوب کے مزاج کی کہ وہ اگر نرم خو ہے تو ایسا جیسے کہ ناہید اور غضب ناک اور ستم شعار ہے تو مانند آفتاب۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

آسماں مشعل ناہید بجھا دیتا ہے
جب بھی کھلتے ہیں ترے بند قبارات گئے

خورشید مزاجی کی مثال ان اشعار سے بھی نکالی جاسکتی ہے جس میں شعراء نے محبوب کے مزاج کی مختلف کیفیتوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے:

خورشید ناز تیرا شبنم نیاز میرا
جلوہ تری کہانی آنسو مرا فسانہ

(کوثر جائسی)

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

(غالب)

انور شیخ حسن کے مزاج داں ہیں، وہ اسکی کیفیتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ دل عاشق کی سیماب وشی سے خوب واقف ہیں اور حسن کے حرف انکار میں پوشیدہ غنچۂ اقرار کی خوشبو کے مزاج سے متعارف۔ اس لئے ان کے یہاں ہونٹوں سے پینے کے بعد تشنہ لبی بڑھ جاتی ہے یعنی ''پانی پیا تو اور گلا سوکھنے لگا'' لیکن ہونٹوں کا اتصال دراصل پیاس بجھانے کیلئے نہیں ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس بادۂ ناب سے جو اس کے ترشے ہوئے لبوں سے چھلک رہی ہے پی کر پیاس اور بڑھتی ہے ''اس نے جب دل کی کہی'' اس مصرعہ میں یہ ٹکڑا بھی قابل غور ہے یعنی دل کی کہانی سے یعنی روداد دل سے اس طرح تشنہ لبی بڑھ جاتی ہے جسے صرف ایک عاشق کا دل ہی سمجھ سکتا ہے اور غزل میں اس طرح کے مفاہیم کا باندھنا خود میں ایک اہمیت کا حامل ہے جس میں حواسی قوتیں ان کے تپتے ہوئے رنگ پیاس کو بجھاتے بھی ہیں، بڑھاتے بھی ہیں کیونکہ نہ اس کے ساغر لب لعلیں میں شراب کم ہوتی ہے اور نہ عاشق کی پیاس بجھتی ہے

اس شراب کورگ و پے میں اتار لینا چاہتا ہے:

مجھے پینے دے پینے دے کہ تیرے جام لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے کچھ اور ہے کچھ اور ہے ساقی

(مجاز)

''غزل گوئی مرد و عورت کے جنسی تعلقات یا عاشقانہ زندگی کی ترجمانی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ مشکل ترین صنف ہے جس میں زندگی کے بڑے بڑے اہم مسائل اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان کرنے میں اعلیٰ درجے کی شاعرانہ قوتیں صرف ہوتی ہیں۔''

(یگانہ چنگیزی)

غزل کے حوالے سے یگانہ کی اس رائے سے کسی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ بڑی شاعری اسی وقت وجود میں آتی ہے جب اسے جمالیات کے حوالے دیکھا جائے، ہمارے یہاں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ پوری عصری حسیت کو جمالیات کے حوالے سے سمیٹا گیا ہے اور اس طرح بڑی شاعری وجود میں آئی ہے۔ اس میں تمام گردش روزگار کے رنگ موجود ہیں، کچھ اسی طرح کی کارفرمائی انور شیخ کی غزلوں میں بھی ہے۔ میں انہیں غزل گوئی میں میر و غالب کا ہم پلہ قرار دینے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں لیکن میں ان رنگوں کو ضرور ابھاروں گا جن میں عشق کا مستحکم حوالہ موجود ہے اور اس طرح پیکر تراشی کا عمل سامنے آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب پیکر بنتے ہیں تو پھر اس کے ساتھ ہی احساس و ادراک کی قوتیں بھی نمو کرتی ہیں، بساط ذہن پر ان کا اس انداز سے ظہور ہوتا ہے کہ ایک سبزۂ خوش جمال چہچہاہٹ میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ انور شیخ کے یہ اشعار دیکھئے:

وہ تھا ہم پر فدا دشمن سے اس کی دوستی کیسی
اسے بوسے دیں شیریں لب مرا دل زور سے دھڑکا

پری رو نے نوازا عید کے دن ایک بوسے سے
پڑا اب ہم کو ہے چسکا کہو جی کیا سنا تم نے

انور شیخ کی تحریریں جوان کے نظریات کی واضح غماز ہیں ان سے ایک مثبت سوچ مترشح ہوتی ہے، ہوسکتا ہے کہ بادی النظر میں لوگوں کے دلوں میں اس طرح کے خیالات آتے ہوں کہ ان کے نظریات منفی ہیں مگر ایسا نہیں ہے، ان کی سوچ کی چٹانوں میں ہزاروں اصنام خوابیدہ ہیں جنہیں ان کے تیشۂ فکر کا لمس باہر لانے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ وہ زمانے کی ہوا کے ساتھ نہیں بہتے ہیں وہ ان سب کو مسترد کر دیتے ہیں جو آنکھیں بند کر کے کسی کی پیروی میں مصروف نظر آتے ہیں وہ اپنی دانش کو بروئے کار لاتے ہیں حالانکہ اس میں ''دین بزرگاں خوش نہ کرد'' والی کیفیت ہوتی ہے مگر یہ سوچ مثبت ہوتی ہے اور یہ انقلاب ہمارے یہاں غالب کی شاعری اور سرسید کی نثر سے آیا تھا جس کی توسیع انور شیخ نے کی ہے، اقبال سے متعلق ان کا نظریہ اہم ہے حالانکہ اس پر لوگ چیں بر جبیں ہو جاتے ہیں لیکن چیں بر جبیں ہونا منصفانہ عمل نہیں ہے آخر کیوں، سب آنکھیں بند کر کے اقبال کی طرف کیوں بھاگیں؟ اقبال کوئی پیغمبر تو تھے نہیں۔

انور شیخ کی تحقیق وتنقید کی بنیادیں مختلف ہیں جس میں انہوں نے نئے نئے پہلو تراشے ہیں جو ان سے پہلے کسی نے نہیں نکالے، ہمارے یہاں ایک روش ہے اگر کسی نے کسی کی تعریف کر دی تو سب اسے عرش عظیم پر بٹھانے لگے، آخر انسانی سوچ کے کچھ منفی پہلو بھی تو ہوتے ہیں جنہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے، تعریف وتوصیف کے دریا بہا دیئے جاتے ہیں، دراصل انور شیخ کی تحریریں انہیں افکار ونظریات سے بغاوت کرتی ہیں اور بغاوت دراصل یوں نہیں کہ دعویٰ بے دلیل ہو اور پھر یہ کہ بغاوت اہل دانش وبینش کا ہی شیوہ ہے کم از کم علم کے میدان میں۔ ہم سب اس جہان آب وگل میں بود وباش رکھتے ہیں، بنی نوع آدم میں سے ہیں، بہتر نہیں ہے کہ اس مخلوق کا سلسلۂ نسب فرشتوں سے جوڑا جائے، انور شیخ کی تمام تر تخلیقات نظم ونثر کے شریانوں میں ایسی ہی آگ دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔

انور شیخ کی تصانیف نظم ونثر کی تعداد بیس ہے، کم وبیش پندرہ کتابیں انہوں نے انگریزی میں لکھی ہیں، سہ ماہی جریدہ ''لبرٹی'' اردو انگریزی صحافت کا ایک شاندار نمونہ ہے خود انور شیخ کی شخصیت وشاعری پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں ہیں جو مشاہیر قلم کاروں نے تصنیف کی ہیں، علاوہ ازیں کتنے ہی مقتدر جریدوں کے گوشے اور نمبران کے نام سے شائع

سل چکے لب سرور بوسہ سے
شکر کیونکر ادا کریں یارو

نہ حیلوں سے کر ہم کو محروم بوسہ
کہ آتی ہے ظالم حیا دھیرے دھیرے

وعدہ بوسے کا کیا لیکن عوض میں دی چپت
اور نخوت سے کہا تم کون تم کون ہو

وہ بوسے بانٹتا ہے اب نہ چاہیں کیا ہوا اس کو
نہ چاہیں کچھ جو خوباں سے ارے ہم ہیں وہ دل والے

تیرے بوسوں کے رس نے یہ کیا کر دیا
اب دعا میں بھی کھلتے نہیں میرے لب

بوسہ اور اس سے متعلق مضامین سے اردو اور فارسی غزل خوب مالا مال ہے۔ انور شیخ نے کلاسیکیت سے جس انداز میں اکتساب کیا ہے اس سے ان کے فکری افق کو مزید وسعت و کشادگی حاصل ہوئی۔ ان کے یہاں اس طرح کے مضامین پر قدما کا گہرا پرتو ہے۔

انور شیخ کے وعدۂ بوسہ کے یہاں بدلے چپت ہے یعنی ایک طرح غالب کی زبان میں دھول دھپا ہے۔ ظاہر ہے کہ شیوۂ محبوب یہ تو نہیں لیکن پیش دستی کا آغاز دھول دھپا ہی جیسی چیزوں پر منتج ہوتا ہے اور یہی اس کا نقطۂ منتہا ہے۔ اس فارسی شعر میں بھی کچھ اسی انداز کا خیال پیش کیا گیا ہے:

قند آمیختہ با گل نہ علاج دلِ ماست
بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند

(عرفی)

عرفی کہتا ہے کہ ہمارے دل کا علاج پھول کے ساتھ قند ملا کر دینے میں نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ چند گالیاں بھی ہوں مگر ان گالیوں میں چند بوسوں کی شیرینی بھی گھلی ہونی چاہئے۔

اس شعر میں خوبی یہ ہے کہ شاعر دل کا علاج طلب کر رہا ہے اور گل قند دل کیلئے مفید ہے لیکن عاشق کے دل بیمار کو گل قند سے شفا نہیں مل سکتی ہے بلکہ اسے دشنام میں بوسے کی آمیزش درکار ہے اور یہی اس کا علاج ہے۔ انور شیخ نے اس خیال کو باندھنے میں اپنا انفرادی رنگ برقرار رکھا ہے۔

بوسہ اتصال لب کی ایک لذت انگیز کیفیت ہے جس میں جذبات کی شیرینی اور کچھ کسک بھی ہے نیز ایک بڑا لمسی پیکر بھی تخلیق ہوتا ہے۔ یہ دیکھئے:

دانا لب تو اگر ببوسد
فتویٰ نہ دہد کہ مے حرام ست

(امیر خسرو)

ظاہر ہے کہ دانا نہ تو تیرے ہونٹوں کے اتصال سے واقف ہے نہ شراب کے ذائقے سے۔ اس لئے اس نے شراب کو حرام قرار دے دیا ہے۔ تیرے لبوں تک تو خیر اس کی رسائی نہیں ہے لیکن اگر کبھی وہ تیرے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ ملا لے اور اس شراب کو اپنی رگ و پے میں اتار لے تو فوراً فتویٰ دے دے گا کہ شراب حرام نہیں کیونکہ اسقدر لذت انگیز شئے حرام کس طرح ہو سکتی ہے۔ انور شیخ نے اپنے یہاں اس خیال کو عید کے دن سے متصف کر دیا ہے، ظاہر ہے کہ عید کا دن خوشی کا دن ہے اس دن تمام انواع و اقسام کی چیزوں سے لذتیں حاصل کی جاتی ہیں تو محبوب کے ہونٹوں سے لذت کا اکتساب کیوں نہ کیا جائے اور اس دن وہ بوسے سے نواز بھی رہا ہے لیکن وہی بات سامنے آ گئی کہ اس نے نواز دیا اب مجھے اس کا چسکا پڑ گیا، میں مسلسل بوسوں کا خواہش مند ہوں یعنی یہ شراب ناب اب اس طرح حلال ہو چکی ہے کہ جس قدر چاہیں پی لیں لیکن ساغر ہونٹوں تک آئے جب بات ہے۔ انور شیخ کا دل اس بات سے بھی دھڑکتا ہے کہ شیریں لبی دوسروں پر بھی مہربان ہے۔ ہم سے دوستی کے باوجود اس کے ہونٹوں کی لذت غیر کو بھی حاصل ہے۔ غالب کے یہاں اس مضمون کو

اس انداز سے بیان کیا گیا ہے:

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو یہ خو کہیں
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کئے

غالب نے بوسے کے بہت سے مضامین باندھے ہیں، عجیب عجیب رخ نکالے ہیں جن میں محبوب کے لئے دھمکیاں بھی ہیں، خدشات بھی کروٹیں لے رہے ہیں:

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

گویا عاشق نیند کے عالم میں محبوب کے رخسار و لب پر بوسے کی مہر ثبت کرنا نہیں چاہتا ہے، وہ پاؤں کا بوسہ لیکر اسے بیدار کرنے کی خواہش رکھتا ہے یا یہ کہ بوسہ لینے کے مواقع تلاش کر رہا تھا تو بوسہ ہی سہی خواہ وہ پاؤں کا ہی کیوں نہ ہو لیکن بدگمانی یہ پیدا ہوگی کہ آخر پاؤں کا بوسہ کیوں، ایسا تو نہیں ہے کہ پاؤں کے بعد ساق سیمیں تک پہونچے اور پھر خورشید کو آئینہ دکھانے والی رانوں تک رسائی حاصل کر لے۔ اس سے اس کے ارادوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ غالب نے یوں بھی کہا ہے:

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منھ میں زبان ہے

زبان انکشاف راز کا کردار تو ادا کرتی ہے، ذائقے کو بھی واضح کرتی ہے یعنی تم نے غیر کو بوسہ دیا ہے ہم زبان سے چاٹ کر اس کا ذائقہ بتا سکتے ہیں۔ ان رخساروں اور لبوں پر کن کن اجنبیوں کے بوسے اپنا ذائقہ چھوڑ گئے ہیں۔ شعر میں محبوب کے رخسار و لب تک رسائی حاصل کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ غالب کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں محبوب کے کردار کو واضح کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا بھی ہے:

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

لیکن یہ تو اس زمانے کے عشق کی باتیں ہیں جہاں محبوب کو عاشق اپنی میراث و ملکیت سمجھتا تھا، وفا کرنے کا بھی خواہش مند تھا اور جواب میں وفاداری کی بھی تمنا رکھتا تھا،

اسے محبوب کا صحبت غیر میں جانا قطعی پسند نہیں تھا۔ مگر آج عالم کچھ اور ہی ہے جیسا کہ اس شعر میں بیان کیا گیا:

پھول سے رخسار ولب ہیں والہانہ چومئے
جسم کی پگڈنڈیوں پر نقش پامت ڈھونڈیئے

آج اتصال غیر، وصال غیر کی کچھ خاص اہمیت نہیں ہے گویا عشق نے اپنی تہذیب بدل دی ہے، اس کی اقدار بدل چکی ہیں لیکن انور شیخ کے یہاں عشق کی وہی تہذیب ہے، وہی قدریں ہیں جو ہمارے اسلاف نے مقرر کی ہیں۔ ان کا محبوب پاکیزہ ہے وہ اِدھر اُدھر بوسے تقسیم نہیں کرتا (عاشق کے خدشات سے قطع نظر) یا پھر اپنے جسم کی پگڈنڈیوں پر ہر کس وناکس کو سفر کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اس کے یہاں عشوہ طرازیاں ہیں۔ وہ بوسے کی شیرینی سے، اس کی قند سے عاشق کے لبوں کو سی دیتا ہے، بند کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ نہ شکر کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ اس لطف خاص کا شکریہ کیسے ادا کریں یا پھر اس کے حق میں دعا کرنے کے لئے لب کس طرح کھولیں۔ دراصل یہ تہذیب عشق ہے بھی اور عشوہ طرازئ محبوب بھی یہی ہے جیسے کہ:

مری حسرت بوسہ کو ناز سے
بری بات ہے، کہہ کے بہلا گئی

(اختر شیرانی)

وصل میں بوسۂ لب دے کے کہا
منھ سے کچھ اور نہ فرمایئے گا

(امیر مینائی)

اختر شیرانی کے یہاں کس انداز سے بوسے کو ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ بری بات ہے اور اس طرح عاشق کی حسرت بوسہ کا اس نے خون کر دیا۔ امیر مینائی کہتے ہیں کہ وصل میں بوسۂ لب تو حاصل ہو گیا لیکن ''منھ سے کچھ اور نہ فرمایئے گا''، گویا بوسہ دے کر لبوں کو بند کر دیا، اپنے لبوں کے اتصال سے مہر لگا دی مبادا یہ خوف تھا کہ بوسے کے حصول کے بعد عاشق کی آتش شوق کچھ اور بھڑکے اور وہ مزید ہم آغوشی کا خواہاں ہو اور جسم کی پراسرار مملکت کی فتوحات

کی طرف قدم بڑھائے۔

متقدمین سے لیکر متوسطین اور متاخرین تک ہمارے یہاں بوسے کے مضامین ملتے ہیں لیکن تہذیبی اقدار کی تبدیلیوں کے ساتھ اور مختلف لمسی پیکر وجود میں آتے ہیں جیسے کہ

بدن کا سارا لہو کھنچ کے آگیا رخ پر
وہ ایک بوسہ ہمیں دے کے سرخرو ہے بہت

(ظفر اقبال)

چٹک کے پھول بنا اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ ایک بوسہ کہ کچھ اتنا بے صدا بھی نہ تھا

(ظفر اقبال)

اس طرح کے مضامین ہر انداز سے باندھے گئے ہیں لیکن انور شیخ کی اقدار اپنی ہیں۔ وہی صنف نازک ہے وہی اس کی نفسیات، وہی عشوہ طرازیاں، وہی لطف ولذت وہی کشش وہی رنگ وہی نغمہ مگر اطوار بدلتے ہیں، عشق کی اقدار بھی تبدیل ہوتی ہیں۔ غالب نے تو بوسے کی تصویر کشی کی ہے، اسے غنچۂ ناشگفتہ سے تشبیہ دیا ہے، دراصل یہ عشق کی وہ منزل ہے جہاں جسم کی زبان کام کرتی ہے، جنبش لب کی کوئی حیثیت نہیں اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آخر عاشق چاہتا کیا ہے۔ مثلاً

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غالب کے اس شعر میں یہ وضاحت ہوتی ہے کہ محبوب بوسہ دینا چاہتا ہے اس کی بھی خواہش ہے کہ اس کے ہونٹوں سے عاشق کے ہونٹوں کا اتصال ہو اس لئے وہ ایک غنچۂ ناشگفتہ عاشق کو دکھاتا ہے لیکن عاشق چاہتا ہے کہ محبوب اپنے منہ سے ہی اپنے ہونٹوں کے بوسے کی تصویر بنا کر دکھائے۔ اس سلسلے میں انور شیخ کے کچھ اشعار دیکھتے چلیں:

نہ لب کھل سکے مانگتے مانگتے جب
لگے کہنے بولو کہ کیا مانگتے ہو

مجھے یاد ہے ترا چومنا، ترا ناز و مستی سے جھومنا
تری سانسوں تانوں کا زیر و بم بخدا وہ آج بھی یاد ہے

اسے بوسے ہمیں لاتیں اُسے وعدے ہمیں گھاتیں
یہ کیسے گل کھلائے ہیں خدا غارت کرے تم کو

سناؤں حالِ دل کیا ہم نشینو! اسے بوسے ہمیں جھوٹی تسلی
یہ کیسا عشق ہے اے نازنینو! اسے بوسے ہمیں جھوٹی تسلی

ان اشعار میں بھی ہماری قدیم اردو شاعری کا حسن موجود ہے یعنی عاشق کا جب مانگتے مانگتے تھک جانا تب محبوب کا ادائے بے نیازی سے کہنا کہ کیا مانگتے ہو گویا اس نے سنا ہی نہیں کہ کیا مانگ رہا ہے بے چارا عاشق۔ دوسرا شعر عشق کی والہانہ کیفیت کو پیش کرتا ہے یعنی مسلسل بوسے لینا فرط انبساط میں رقص کرنا، جھومنا انتہائے انبساط میں سانسوں کا زیر و بم گویا ایک پرشکوہ سمندر میں مدوجزر کی کیفیت سامنے آتی ہے۔ سانسوں کا اترنا چڑھنا بھی جذبے کے فزوں تر ہونے کی دلیل ہے شدت جذبات میں بے قراری کی غماز۔ تیسرے شعر میں عاشق ایک طرح کی جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کر رہا ہے پھر بھی اس کے تغافل، اس کے سلوک کا شکوہ کناں ہے۔ چوتھا شعر بھی شکوہ کا ہی پیکر ہے لیکن اس میں سلوک یار کے مختلف رنگ دکھائے گئے ہیں۔

''عورت اور مرد کی محبت کی شدت اور ان کی جذباتی کیفیتوں کی بڑی اہمیت ہے وہ سب جو جمالیاتی تجربے حاصل کرتے ہیں انہیں محسوس بھی کرتے ہیں لیکن ان سب کا فنکارانہ اظہار تو نہیں کر سکتے، تخلیقی فنکار ہی ان جمالیاتی تجربوں کو ایسے تمثیلی اور ڈرامائی انداز میں پیش کرتا ہے کہ ان کی سطح بلند ہو جاتی ہے، اس حد تک وہ اپنی تازگی کیلئے زندہ رہتے ہیں۔ فنکار کے ذہن کی شادابی انہیں زندگی بخش دیتی ہے۔ اسی شادابی کا کرشمہ ہے کہ اکثر تحیر پیدا

ہوتا ہے۔محسوس ہوتا رہتا ہے کہ ہمیں جو جمالیاتی انبساط حاصل ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ فنکار کے تحت الشعور میں انبساط وشادمانی موجود ہے۔اشعار کی سادگی و پرکاری، لہجے کے معصوم و پاکیزہ انداز سے ڈرامائی کیفیت اور پرکشش ہوجاتی ہے۔ جمالیات کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ عشق ومحبت کے جمالیاتی تجربوں میں بار بار ایسی اٹھان پیدا ہوتی ہے کہ حیرت انگیز مسرت حاصل ہوتی ہے، اکثر وجد وکیف کی عجیب کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔''

(پروفیسر شکیل الرحمٰن)

پروفیسر شکیل الرحمٰن کی اس تحریر میں جمالیات کے لامحدود انبساط کی تصویر کشی کی گئی ہے، یہاں فراق کا یہ شعر یاد آتا ہے

کہیں سما نہ سکا جب نشاط لامحدود
تو اس کو حسن نے دو مٹھیوں میں بند کیا

شکیل الرحمٰن کہتے ہیں کہ وہ جمالیاتی انبساط جو تخلیق کار کے ذہن میں ہوتا ہے وہ رنگوں لفظوں آوازوں کے پیکر اختیار کر کے نمود کرتا ہے، عام آدمی میں جذبے کی شدت ہوتی ہے۔مرد عورت کی محبت کے لئے کسی زمرے طبقے قوم نسل ذات پات کی تفریق نہیں۔ یہ تو ایک جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کے بے حد قریب لاتا ہے، لمسی پیکروں کی بھرمار ہوجاتی ہے لیکن شاعر اس جذبے کا اظہار کرنے پر قادر ہوتا ہے ایسا خوبصورت اظہار کہ عقل دنگ رہ جائے۔ تحیر اس قدر پیدا ہو کہ تمام کائنات نقش حیرت دکھائی دے ''ہر کہ فکرت بکند نقش بود بر دیوار''

انور شیخ کے یہاں اس طرح کی تماثیل وافر تعداد میں موجود ہیں مثلاً حنا کے مضمون کو ہی اٹھائیں تو ان کے یہاں کیسی پرشکوہ دنیا نظر آتی ہے اور جذبے کا ارتعاش صاف سنائی دیتا ہے۔مہندی کا اردو فارسی شاعری میں ایک اہم مقام ہے اس سے متعلق طرح طرح کے مضامین باندھے گئے ہیں۔اس سلسلے میں انور شیخ کے دو شعر پیش ہیں:

حنا کیسے چھپائے تیرے ہاتھوں میں کھنچی ہیں جو
لکیریں میری بدنامی، تباہی، بے نوائی کی

کافر ادا پلائے تو پینا نہیں گناہ
دیکھا ید حنائی تو پیاس اور بڑھ گئی

حنا سے متعلق فارسی اور اردو میں کئی اہم استعاروں کا استعمال کیا گیا ہے، کہیں مہندی کو خون جگر کہا گیا ہے کہیں اسے خون ناحق بتایا گیا ہے، معشوق کے دست حنائی سے عاشق کے جگر تک ٹھنڈک پہنچنے کی بات بھی کی گئی ہے۔ لیکن انور شیخ نے اپنے شعر اول میں حنا کو لکیروں کا مہین پردہ کہا ہے کہ حنا ان لکیروں کو چھپا نہیں سکتی جو تیرے ہاتھوں میں مجھے بدنام کرنے تباہ کرنے بے سروسامان و بے نوا بنانے سے متعلق ہیں یعنی تو عاشق پر ستم کرتا ہے، تو خواہ کتنی ہی گہری حنا باندھ لے یہ لکیریں ظاہر ہو جائیں گی۔ یہاں مجھے غنی کاشمیری کے ایک شعر کے حوالے سے سراج الدین خاں آرزو کا یہ قول یاد آتا ہے کہ جب انہوں نے غنی کاشمیری کا یہ شعر سنا:

حمائل کرد شیریں دست خود در گردنِ خسرو
مگر میل حنا بستن بہ خون کوہکن دارد

تو بے اختیار کہہ اٹھے کہ کاش آج غنی کاشمیری ہوتے تو میں اپنا سارا سرمایۂ فکر سخن ان کے سپرد کر دیتا ہے اور ان سے یہ شعر مانگ لیتا۔ غور کیجئے کہ اس شعر کی خوبی کیا ہے، فرہاد کوہکنی میں مصروف ہے، پیرزن مرگ شیریں کی جھوٹی خبر لاتی ہے، فرہاد اسے سچ سمجھ کر تیشہ اپنے سر پر مار لیتا ہے، خون کی دھار بہہ نکلتی ہے، فرہاد ختم ہو جاتا ہے، خسرو پرویز جس نے مرگ شیریں کی جھوٹی خبر پھیلائی ہے شیریں سے شادی کر لیتا ہے۔ جملۂ عروسی میں شیریں خسرو پرویز کی گردن میں اپنے دست حنائی حمائل کرتی ہے تو گویا حنائی ہاتھوں کی نمائش نہیں بلکہ خون کوہکن کا اظہار ہوتا ہے۔ خسرو پرویز کی گردن میں بانہیں حمائل کرنا اس کی گردن تک ہاتھ لے جانے کے مترادف ہے گویا فرہاد کی موت کا اصل ذمہ دار وہی ہے۔ یعنی شیریں اس ادائے دلبری سے خسرو پرویز کو فرہاد کا خون دکھا کر اس کی گردن ناپنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انور شیخ کا شعر ہر چند کہ اس قدر تفصیلات نہیں رکھتا ہے لیکن غنی کے شعر کے بہت قریب پہونچ جاتا ہے، حنا کے موضوع پر کچھ اور اشعار پیش کرتا ہوں جو متقدمین اور متوسطین کے یہاں سے آئے ہیں۔ ان اشعار کی تکنیک قابل دید ہے، ان میں ہر طرح کے رنگ کی شوخی ہے، روشنی

ہے اور تنوع ہے:

چھیڑتی ہے مجھے بیباکیٔ خواہش کیا کیا
جب کبھی ہاتھ وہ پابند حنا ہوتے ہیں

(حسرت موہانی)

سردیٔ حنا پہونچے ہے عاشق کے جگر تک
معشوق کا گر ہاتھ میں ہو دست حنائی

(ذوق)

برگ حنا اُپر لکھو احوال دل مرا
شاید کہ رفتہ رفتہ لگے دلربا کے ہاتھ

(مظہر جان جاناں)

جب وہ پیروں میں حنا باندھتے ہیں
میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں

(غالب)

نہا کے اوس میں جب صبح جگمگاتی ہے
کسی کے دست حنائی کی یاد آتی ہے

(زیب غوری)

ان اشعار میں خاص طور پر غالب اور حسرت موہانی کے یہاں جو شوخی و شرارت ہے وہ دیکھتے ہی بنتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ ہے کہ محبوب پیروں میں مہندی لگانے سے پہلے عاشق کے ہاتھوں کو باندھ دیتا ہے کیونکہ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ پیروں میں لگی ہوئی مہندی اسے ایک ہی جگہ اسیر رکھے گی اور یہ کہ اس عالم میں جب کہ وہ تقریباً اپنے کو بچانے کے قابل نہیں ہوگا عاشق اس سے مختلف انداز کی چھیڑ چھاڑ کر سکتا ہے اسے گدگدا سکتا ہے اور یہ لمحہ اس کے لئے لذت انگیز کم مشکل آمیز زیادہ ہوگا۔ عاشق کے جب ہاتھ بندھے رہیں گے تو معشوق عاشق کی شرارتوں کے محفوظ رہے گا۔ غالب کے شعر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ معشوق عاشق کی شرارتوں سے واقف ہے کیونکہ وہ اکثر اسے تنگ کرتا رہتا ہے

لیکن حسرت موہانی کے یہاں عشق کی تہذیب کا انداز کچھ اور ہی ہے، کہ عاشق محبوب کے پابند حنا ہاتھوں کو دیکھ کر شرارت کرنے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے مگر کرتا نہیں اس کے دل میں شرارت چٹکیاں لیتی ہے اسے چھیڑ چھاڑ کرنے پر اکساتی ہے، مگر معشوق بھی خود کو محفوظ سمجھتا ہے کہ عاشق اسے پریشان نہیں کرے گا اس لئے وہ ہاتھوں میں مہندی لگاتا ہے۔ ان دونوں اشعار میں ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگانے کی دو مختلف کیفیتوں کا بیان ہوا ہے، دونوں اشعار میں چھیڑ چھاڑ اور گدگدانے کی کیفیت بھی ہے، اس طرح ایک لمسی پیکر بھی سامنے آجاتا ہے۔ اسی رنگ میں انور شیخ کا یہ شعر بھی دیکھئے جس میں حنا تو نہیں ہے لیکن چھیڑ چھاڑ کچھ اسی قسم کی ہے:

بڑی مدتوں بعد مجھ سے ملے ہو
تمہیں گدگدانے کو جی چاہتا ہے

بیباکی، چھیڑ چھاڑ محبوب کو ستانے کا شوق سب کچھ انور شیخ کے اس شعر میں موجود ہے۔

ذوق دہلوی کے شعر میں ایک بڑا لمسی پیکر سامنے آتا ہے جو عاشق و معشوق دونوں کے اتصال کی کیفیت کو واضح کرتا ہے یعنی اگر معشوق کا دست حنائی عاشق کے ہاتھوں میں آجائے تو پھر حنا کی ٹھنڈک عاشق کے جگر تک جائے گی لیکن حنا خود اپنی تاثیر میں تو ٹھنڈی ہے مگر اس کا رنگ آگ سے ملتا جلتا ہے۔ اس لئے وہ آتش شوق کو مزید بھڑکانے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہاں حنا کی سردی اصل میں ایک تمازت کی کیفیت کو واضح کرتی ہے۔ مظہر جانِ جاناں جو اردو کے بہت قدیم شاعر ہیں، انہوں نے تو ندرت آفرینی کی شاہراہ میں ایک سنگ میل نصب کر دیا یعنی دل کا حال محبوب تک کس طرح پہنچے۔ ان کے یہاں برگ حنا اصل میں ایک صفحۂ قرطاس ہے جس پر حال دل رقم کرنے کی بات کہی جا رہی ہے گویا کہ برگ حنا ایک کشتی مراسلہ ہے جو رفتہ رفتہ دلربا تک پہونچے گا۔ یہاں ہاتھ لگنا پہنچنے کے معنی دے رہا ہے جبکہ مہندی لگنا بھی ایک محاورہ ہے اس طرح حنا اس کے ہاتھ لگے گی تو وہ عاشق کے دل کا حال جان لے گا لیکن پڑھ کر نہیں بلکہ جب شعلۂ حنا اس کے ہاتھوں میں لَو دینے لگے گا تو وہ سمجھ لے گا کہ عاشق نے اپنے دل کی آگ کو کس انداز سے لفظوں میں بند کر کے اسے برگ حنا پر منقش کر کے مجھ تک پہونچانے کی سعی کی ہے۔ یہاں دل میں بھڑکی

ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے، اس سلسلے میں جناب ساحر شیوی کی چند سطور دیکھئے:

''انور شیخ کو شاعری کا وصف فطرت سے عطا ہوا ہے، یعنی یہ وہبی شاعر ہیں، اپنے بل بوتے پر شاعری کی اصناف پر قدرت حاصل کی، کسی کے سامنے کسی کے تلامذہ میں شامل نہیں ہوئے، اس میدان میں وہ تلمیذ الرحمٰن ہیں، انہوں نے فن شاعری مختلف کتابوں سے اپنی کاوش سے حاصل کیا، بچپن میں لوک داستانیں سن سن کر انکا جمالیاتی ذوق پروان چڑھا، اگر چہ انور شیخ نے شاعری کو کبھی سنجیدگی سے نہیں برتا مگر شاعری جس کو بھی چمٹ جائے کسی بھی عمر میں خوار کر سکتی ہے، شاعری کا نشہ جس کو چڑھ جائے پھر وہ مشکل سے ہی اترتا ہے، انور شیخ اپنے مجموعۂ ثانی ''سوز و ساز'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے اردو زبان کو سمجھنے کیلئے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کئے، مولوی (فاضل) کی تیاری کر رہا تھا کہ برطانیہ آنے کا موقع مل گیا، علم عروض سے بھی آگہی حاصل کی لہذا فنکار کی حیثیت سے کسی بھی کسر نفسی کا شکار نہیں ہوں بلکہ مجھے اس بات سے تسکین ملتی ہے کہ ادبی حلقوں سے اتنے طویل عرصہ تک غیر حاضری کے باوجود بھی ذوق شعری سے محروم نہیں ہوا۔

انور شیخ اپنی عمر کی ڈائمنڈ جبلی منا چکے ہیں اور انہیں گلشن ادب میں وارد ہوئے نو دس سال بھی ہو چکے ہیں لیکن ان پر شعر و ادب کا ذوق اور نشہ اسقدر طاری ہے کہ وہ مسلسل لکھتے جا رہے ہیں، نظم ہو یا نثر ہر میدان میں روشنی بکھیر رہے ہیں۔ اس دوران انہوں نے اردو ادب کو گنج رواں عطا کیا ہے، مختصر سے عرصے میں اردو ادب کو سات نئی اصناف سخن سے روشناس کرایا ہے (۱) تکونی (۲) کہمن (۳) غزالہ (۴) منظومہ (۵) متضاد نظم (۶) محبوبہ (۷) مکرولی۔ اس صورت میں انہیں ایک مجتہد کہنا نامناسب نہیں ہوگا، مجاہد اردو ادب نہ کہنا بھی ہماری کور ذوقی ہوگی، جب تک اردو زندہ ہے ان کی یہ نئی اصناف سخن انہیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

ہوئی عشق کی آگ اور حنا کا آتشیں رنگ ایک دوسرے کے مماثل نہیں۔ آخری شعر زیب غوری کا ہے جن کا شمار متاخرین میں ہوتا ہے، اس شعر میں صرف ایک منظر تخلیق کیا گیا ہے کہ شبنم میں دُھلی ہوئی صبح جس میں شفق کی آمیزش بدرجۂ اتم ہوتی ہے اس کی روشنی، اس کی ٹھنڈک محبوب کے دست حنائی کی یاد دلاتی ہے گویا کہ صبح نہیں بلکہ حنائی تحریروں سے مزین اک خوبصورت ہاتھ ہے۔ اس شعر میں یونانی شاعر ہومر کا انداز جھلکتا ہے جس نے اپنے رزمیے میں بار بار حنائی انگلیوں والی صبح کا ذکر کیا ہے۔ انور شیخ کا ایک شعر جس کا حوالہ میں نے گذشتہ صفحات میں دیا ہے جس میں حنا کو شراب سے تعبیر کیا گیا ہے اس پہلو میں بے حد ندرت ہے کیونکہ شراب میں آگ کا ہونا اس کے تیکھے پن کی علامت ہے اور دست حنائی میں جو رنگ کھِل رہے ہیں وہ دراصل شراب کے رنگ ہیں۔ چنانچہ کافر ادا دست حنائی سے پلا رہا ہے لیکن پیاس ہے کہ بجھنے کا نام نہیں لیتی کیونکہ اس کے ہاتھ میں لگی ہوئی حنا کا رنگ شراب کی سرخی سے مماثل ہے۔

اس طرح یہ منظر کھلتا ہے کہ انور شیخ کے سینے میں ایک ایسے عاشق کا دل ہے جو محبوب کی اداؤں پر قربان ہوتا رہتا ہے کیونکہ ان کی جمالیاتی تہذیب میں عورت ایک بلند مقام پر فائز ہے اور طرح طرح سے ان کے وجود میں خود کو جذب کرتی رہتی ہے اس مربوط سلسلہ میں ان کے یہ اشعار قابل توجہ ہیں:

وقت رخصت جو چوما تھا تو نے مجھے
تیری اس مہربانی کی یاد آگئی

چومتے کسی کو ہو پر گمان کرتا ہوں
کیا ہوا کہ دل سے تو مجھ پہ ہی فدا تم ہو

ہمارے خوں کا جب بھی تذکرہ ہو ان کی محفل میں
تو وہ کرتے ہیں باتیں ناز سے اپنے پسینے کی

لذتِ بوسہ کے گرچہ ایک ہم ہیں قدرداں
مہرباں لیکن گنواروں پر تو وہ نادان ہے

لکھوں میں خط میں کیا تجھے ہوں سوچتا یہی
ہے دل کی بات پہلے ہی تیری زبان پر

تیری نگاہ ناز میں کچھ ایسی بجلیاں
گر ہم فریب عاشقی میں لٹ گئے تو کیا

انور شیخ کی غزلوں کا مکالماتی انداز ان میں معنویت کو اور بھی فزوں تر کرتا ہے۔ ان کے یہاں صنف نازک عشووں پر جان دینے کی اداضرور ہے مگر وہ ان تمام باتوں سے واقف ہیں جو ایک معشوق میں ہوتی ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ عورت کی نفسیات کے ماہر ہیں چنانچہ ان کی غزلوں میں جہاں کہیں اس طرح کا انداز ہوتا ہے تو صاف ظاہر ہے وہ جس سے مخاطب ہیں وہ وہی ہے جس کی تخلیق میں خالق کائنات نے تمام حسن فطرت کی آمیزش کر کے ایسا شاہکار تخلیق کر دیا جو حسن فطرت کی آمیزش کے باوجود اس سے کہیں بالاتر ہے کہ حسن فطرت کی کسی بھی شئے یا منظر سے اس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔

***

انور شیخ کی غزل میں ادراک جمال

بہ گلشن دگرے چشم من نمی افتد
گل مراد شگفت از سفال خویش مرا
(غنی کاشمیری)

ادراک جمال کے بسیط موضوع پر غنی کاشمیری کا یہ شعر گونا گوں اہمیتوں کا حامل ہے جہاں شاعر کا گل مراد خود اس کی ہی مٹی میں کھلتا ہے ظاہر ہے کہ جس کا گل مراد خود اس کی ہی مٹی میں کھلے تو پھر مٹی کے زرخیز ہونے کی انتہا کیا ہوگی اور وہ پھر وہ دوسرے کے گلشن کی طرف کیوں نگاہ مرکوز کرے گا، پھول ہی سرمایۂ بہار ہے، چراغ گلشن ہے، آئینۂ جمال ہے، اور سب کچھ اسی مٹی میں موجود ہے جس سے انسان کی تخلیق کی گئی ہے۔ پھر خوشبوؤں کا سارا خزانہ، لذتوں کے ذخائر، احساسات کے رنگوں کی مستی ان تمام اشیاء کی تلاش کہیں اور کیوں کی جائے خود ہماری ہی مٹی کی تحویل میں سارا سرمایۂ بہار روشن ہے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ جمال دراصل وہی ہے جو عناصر اربعہ کی کوکھ سے طلوع ہوتا ہے۔ اس طرح حسن و جمال کے درمیان ایک خط فاصل کھنچ جاتا ہے دونوں کا فرق سامنے آجاتا ہے، حسین ہونا اور شئے ہے جمیل ہونا کچھ اور ہے۔ (حسین و جمیل جیسے مرادفات پر ہمارے صاحب طرز نثر نگاروں نے اعتراضات بھی کئے ہیں) انسان چونکہ خلاق اعظم کی تقویم احسن ہے اس لئے اس نے اپنے عظیم المرتبت جمال کا ایک ذرہ ان عناصر کو بھی دے دیا ہے جس سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے، اس طرح آب و خاک، باد و آتش باہم آمیز ہو کر پیکر بشریت میں نمودار ہوئے ہیں اور لذتوں کا ایک جہانِ غیر فانی آباد نظر آتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں سے عشق کی مستی کا آغاز ہوتا ہے۔ حسن کے علی الرغم جمال زیادہ دلکشی کا باعث ہوتا ہے اور جمال بڑی حد تک غیر فانی بھی ہے جبکہ حسن فانی ہے کیونکہ جمال صفات کا ایک حصہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بلبل پھول کے عشق میں گرفتار ہوتی ہے، پھول ایک محدود مدت تک ہی اپنی بہار دکھاتا ہے پھر اس کے

ہیزم حیات میں خزاں کی چنگاری داخل ہوتی ہے، اس کے وجود کو خاکستر کر دیتی ہے لیکن پھول پھر اپنے عاشق بلبل کیلئے جنم لیتا ہے، حالانکہ ماہ و سال پر محیط یہ ہجر کے لمحات بلبل پر گراں ہوتے ہیں لیکن پھول پھر بساط حسن پر ظہور کرتا ہے تا کہ اپنے عاشق بلبل کو اپنے دیدار سے سرشار کر سکے اور اس لمحۂ دیدار کیلئے بلبل کی آنکھیں روشن رہتی ہیں اور ہجر کے لمحوں میں بلبل پھول کے جمال کا نظارہ مسلسل کرتا رہتا ہے ورنہ پھول تو ننھی منی پتیوں کا ایک مجموعہ ہے، اسے زرد بھی ہونا ہے، بکھر بھی جانا ہے لیکن نقاب خاک سے گل کے نمودار ہونے کا لمحہ بیحد انبساط آمیز اور فرحت انگیز ہے جیسا کہ اس شعر میں اظہار کیا گیا ہے:

دلیل خواہش خوباں ہمیں بس عشق بازاں را
کہ گل یک سالہ رہ از بہر بلبل بازمی گردد

(صیدی تہرانی)

اس شعر میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ صرف بلبل ہی پھول کا عاشق نہیں ہے بلکہ پھول بھی اس کا خیال رکھتا ہے، ہر سال اس کے لئے لوٹ آتا ہے، شاخ میں کھلتا ہے، اپنے عاشق کو فرحت بخشتا ہے، یہ ہے مٹی کا کمال اس کا ادراک جمال۔ جمال جو غیر فانی ہے حسن جو فانی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیزیں بادی النظر میں خوبصورت نہیں ہوتیں مگر ان میں جو جمال ہے وہی ان کی دلکشی اور رعنائی میں اضافے کا سبب بنتا ہے اور انہیں بساط دوام کا نقش غیر فانی بنا دیتا ہے۔

ادراک جمال کا یہ جلوہ انور شیخ کی غزلوں میں خوب نظر آتا ہے اور اس بات کا سراغ دیتا ہے کہ جو اعلیٰ اور معیاری ادب انہوں نے مطالعہ کے ذریعہ اپنی روح میں جذب کیا ہے وہ کس انداز سے ابھر رہا ہے، اس طرح قوس قزحی رنگ بہتے ہوئے دریاؤں کی سامنے آتے ہیں جن میں دور تک سحابوں کی کشتیاں ہوتی ہیں، ایک پرشکوہ منظر کھلتا ہے، ان کشتیوں کے سفر کا اور ہر کشتی میں ایک ناظورۂ خوش اندام اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے:

جہان کیا ہے کبھی تو نے یہ بھی غور کیا
ترا جہان تری وسعت نظر ہی تو ہے

خود کو جب پرکھا تو سمجھے ہم بھی اسرار وجود
خود میں کھو کر خود کو پالینا ہے اصلی زندگی

نہ ہو دل میں عروجِ زندگی کی جب تڑپ باقی
تو بن جاتا ہے ہر لحظہ زوال آہستہ آہستہ

کوئی دریا نہیں ایسا چلاؤں میں جہاں کشتی
جدھر دیکھو سمندر ہے میں گر چاہوں نہ رو پاؤں

انور شیخ کے ان اشعار میں ان جمالیاتی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے جو زندگی سے بے حد قریب ہیں، حقائق پر مبنی ہیں کیونکہ وہ سارے رنگ جو طائرانِ خوش پرواز کی طرح اڑ جاتے ہیں وہ زندگی کے اصلی رنگ نہیں ہوتے بلکہ جو قائم رہتے ہیں وہی اصل میں رنگوں کی تعبیر پیش کرتے ہیں اور عناصر اربعہ سے متمیز ہیں یعنی پانی، مٹی، آگ، ہوا۔ لیکن ان عناصر کا جوہر ہی دراصل باقی رہ جاتا ہے اور جمال کی یہی کیفیت ہے جو نظر کم آتی ہے محسوس زیادہ ہوتی ہے اور جو محسوس زیادہ ہوتی ہے وہی غیر فانی ہوتی ہے۔ گویا ارسطو کی زبان میں نقش مٹ جاتا ہے لیکن عکس باقی رہتا ہے۔ کوئی بھی شئے جسے ہم دیکھتے ہیں، کوئی بھی منظر جو ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے، کوئی بھی واقعہ جو گزرتا ہے لمحاتی ہوتا ہے۔ یعنی نقش ذرا دیر کے بعد اڑ جاتا ہے جس طرح دھوپ رنگ بہار کو اڑا دیتی ہے لیکن اس کے عکس جاوداں رہتے ہیں۔ جمال کے یہی وہ جلوے ہیں جو دریائے فنا سے ہمکنار نہیں ہوتے ہیں:

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار باد، یاں

(غالب)

پھر جب یہ طے پا گیا کہ تمام اجزائے آفرینش زوال آمادہ ہیں کسی وقت بھی انحطاط کے اعماق میں پناہ گیر ہو سکتے ہیں مگر خورشید عالمتاب جو سارے زمانے کیلئے بالخصوص کرۂ ارض پر زندگی کے جام شیریں لنڈھا رہا ہے وہ ہوا کی راہ کا چراغ بن جاتا ہے یعنی ہوا اور چراغ کی لَو کے درمیان جنگ جاری ہے۔ آخر کار چراغ کی لَو تھک جاتی ہے مگر ہوا تھکتی نہیں کیونکہ ہوا دراصل جمال کا اعلامیہ ہے جبکہ چراغ اپنے ظاہری وجود میں حسن کا پیکر ہے اور فانی۔ ہوا غیر فانی ہے، آگ اور ہوا چونکہ دونوں ہی عناصر اربعہ میں سے ہیں اس لئے چراغ اگر بجھ جاتا ہے تو تادیر اس کا دھواں فضا میں باقی رہتا ہے۔ اس سے متعلق فارسی اور اردو ادب میں

ان گنت استعارے وضع کئے گئے ہیں لیکن دراصل بنیادی پہلو یہی ہے کہ اگر عناصر میں جنگ جاری نہ رہے تو پھر کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی اور فن کا جمال اس انداز سے نہیں نکھر سکتا کہ جس انداز سے نکھرتا ہے۔ عناصر بظاہر مصروف جنگ نظر آتے ہیں مگر ان میں دوستی خوب ہے مثلاً ہوا چراغ کو بجھاتی ہے مٹی کو اڑاتی ہے، پانی کو چھوتی ہے جھولا جھلاتی ہے، بادلوں کی چھاگلیں لاتی ہے، بستیوں کو سیرابی کے عمل سے گزارتی ہے لیکن آگ کو بھڑکانے کا کام بھی کرتی ہے۔ مٹی کو ایک جگہ جمع کرنے کا کام بھی وہی کرتی ہے پھر اس پیکر خاکی میں قیام بھی کرتی ہے اور اسے زندگی بخشتی ہے۔ یہی زندگی کا جمال ہے۔ گذشتہ صفحات میں میں نے انور شیخ کے جو اشعار آپ کے سامنے پیش کئے ان میں پہلا شعر جہاں وسعت نظر کی طرف اشارہ کرتا ہے، شاعر کہتا ہے کہ دنیا بے حد تنگ ہے لیکن ہم اپنی چشم بصارت سے نہیں بلکہ دیدۂ بینا یا چشم بصیرت سے جہاں تک دیکھ سکتے ہیں وہی ہماری دنیا ہے یعنی ہم افق کو دیکھتے ہیں جو مرکز نگاہ ہوتا ہے مگر جب ہم وہاں پر پہونچ جاتے ہیں تو افق پھر بہت دور چلا جاتا ہے۔ دنیا محدود بھی ہے اور لامحدود بھی۔ دوسرے شعر میں خود کو پرکھ لینا ہی اصل زندگی ہے یعنی زندگی کا سراغ پالینا ہی دراصل جمال حیات ہے۔ تیسرے شعر میں پسپائی کی ایک خاص کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ درخشاں عزائم ہی زندگی کو عروج دیتے ہیں ورنہ ہر لحظہ زوال ہی زوال ہے گویا زوال کا ایک ہی شرر آتش فشاں تمام کشت حیات کو خاکستر کرسکتا ہے۔ چوتھے شعر میں مسلسل سفر پیش کیا گیا ہے وہ بھی پانی میں، پانی جو عناصر اربعہ میں ایک خاص مقام کا حامل ہے جب پانی ختم نہیں ہوتا تو ساحل کہاں سے نظر آئے جہاں میں اپنی کشتیاں جلادوں تاکہ سفر ختم ہوجائے میں چاہتا ہوں کہ رولوں مگر میں رو نہیں سکتا کیونکہ ہر لمحہ ایک سمندر ہے اور میرے آنسو سمندر کا ایک حصہ بن جائینگے جہاں اس عظیم الشان آبی پیکر کے سامنے میرے آنسوؤں کے حقیر قطروں کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

جمالیات کی تشریحات وتعبیرات میں عام طور پر ہمارے شارحین وناقدین نے منصفانہ طریقہ اختیار نہیں کیا ہے۔ اردو کی غزل کی جمالیات کو فارسی سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا کیونکہ سارا نظام وہیں سے شروع ہوتا ہے، الفاظ تراکیب ڈکشن سب کچھ وہیں سے آتا ہے۔ تشبیہات واستعارات کی ایک عظیم الشان دنیا ہے جس میں محسوسات کے دلچسپ پیکر بھی ہیں اور یہ کہ جمال وہی ہے جو غیر فانی ہے۔ مثلاً اگر خوشبو کسی شئے کے اندر جاگزیں

ہوتی ہے تو اس کا اظہار رنگ کی شکل میں نہیں احساس کی شکل میں کیا جانا چاہئے، مثلاً سعدی کی ایک نظم کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جس میں مٹی کے ایک ٹکڑے سے مکالمہ ہے جو مہک رہا ہے، ظاہر ہے کہ مٹی کا مہکنا اس بات کی طرف گمان کو لے جاتا ہے کہ وہ ایسے ہاتھوں سے مل کر آئی ہے جن کی خوشبو غیر فانی ہے۔ ایسا ہاتھ جس کا لمس پا کر ہر چیز شاداب و تازہ ہو جاتی ہے اور یہی نہیں کہ وہ شادابی اور تازگی غیر فانی بن جاتی ہے، اس نظم میں غزل کا جلوہ صاف ظاہر ہے:

گلے خوشبوئے درحمام روزے — رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہم نشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ان اشعار میں مستفسر نے مٹی سے یہ پوچھا ہے کہ وہ مشک ہے یا عبیر ہے کہ اس کی خوشبو مستفسر کو مست کئے دیتی ہے۔ خیال سوال کرنے والے کا یہ ہے کہ مٹی دست محبوب کے لمس سے سرشار ہو کر آئی ہے۔ ہر چند کہ قلیل ہے لیکن اس کی خوشبو سوال کرنے پر اکساتی ہے لیکن مٹی یہ جواب دیتی ہے کہ میں ناچیز مٹی ہوں لیکن بہت عرصہ پھول کے ساتھ رہ چکی ہوں، میرے رفیق میرے ساتھی میرے ہم نشیں کا جمال ہے جو مجھ میں رچ بس گیا ہے۔ ورنہ میں تو بس مٹی ہوں جیسے کہ مٹی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مٹی نے یہ نہیں کہا کہ میں پھول کے ساتھ کس طور پر رہی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شجر گل کی جڑوں میں مسکن گزین رہی ہو پھول چونکہ اسی مٹی سے کھلا ہوتا ہے اس لئے وہ مٹی کو بھی مہکا گیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ مٹی دست محبوب میں رہی ہو کیونکہ اس مصرعہ میں ''ولیکن مدتے باگل نشستم،، میں پھول دست محبوب کا استعارہ بھی ہوسکتا ہے تو پھر مٹی محبوب کے ساتھ ہی رہی ہوگی۔ اس طرح جمال ہم نشیں اس میں اثر کر گیا ہوگا اور وہ مہک رہی ہوگی۔ لیکن پتہ یہ چلتا ہے کہ خواہ گل ہو یا دست محبوب کچھ بھی ہو جمال اصل میں خوشبو ہے مٹی کا رنگ نہیں۔ کیونکہ شاعر نے شروع میں ہی، گلے خوشبوئے، کی ترکیب استعمال کی ہے۔ گل کو حسین نہیں کہا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مٹی میں جو مہک ہے وہ جمال ہے اور وہ غیر فانی ہے۔ رنگ تو فانی ہوتے ہیں اس لئے جمال کی تعریف میں نہایت محتاط انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ جمال محبوب کا جسم ہے مکمل جسم یا پھر اس کا کوئی عضو جسم جس میں خوشبو کا خزانہ موجود ہے۔ جمال کی بات چلی ہے تو آنند رام مخلص

کا بھی یہ شعر دیکھیں:

ناخن تمام گشت معطر چوں بوئے گل بند قبائے کیست کہ وا می کنیم ما

بند قبا کھولنے کا کام چونکہ ناخن سے لیا گیا ہے اس لئے وہ معطر ہے اور اس لئے کہ قبا بھی معطر ہے۔ قبا محبوب کے جسم کے لمس اور خوشبو میں نہائی ہوئی ہے اس لئے مہک رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے جو ہاتھ بھی چھوے گا مہک اٹھے گا اسی لئے شاعر کہتا ہے پھول کی خوشبو کی طرح میرا ناخن مہک اٹھا۔ آخر میں نے کس کا بند قبا کھولا اور اس طرح خوشبو میرے ناخن پر مہربان ہوئی ہے۔ ایک شعر یہ بھی دیکھئے کہ اردو میں ہے:

یہ ماہتاب ترے رنگ سے قریب سہی
کہاں سے لائے گا خوشبو ترے بدن کی طرح

(زیب غوری)

صاف ظاہر ہے کہ ماہتاب کے پاس حسن تو ہے مگر جمال نہیں۔ محبوب کا جسم حسن کا مرکز بھی ہے اور شکوہ جمال سے لبریز بھی۔ وہاں رنگ بھی ہے خوشبو بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان منظروں میں محبوب کے جسم کو چاند سے کس طرح تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ چاند تو محض ایک کاسۂ دریوزہ گری ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مٹی ہو یا ناخن محبوب کے جسم کی خوشبو سے یا پھول سے مہک کا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ گویا یہ بھی اکتساب کا ایک عمل ہے لیکن ماہتاب اگر محبوب سے ہم آغوش بھی ہو جائے تب بھی اس کے جسم کی خوشبو چرا نہیں سکتا۔ اس طرح خوشبو ہوا میں گھل جاتی ہے، ہوا کو معطر کر دیتی ہے، کبھی ہوا زلف یار کی خوشبو اڑا کر لے جاتی ہے، ہوا اس کے جسم کے رنگ سے واسطہ نہیں رکھتی۔ اس طرح یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ جمال کی تخلیق اور اس کے عناصر میں عناصر اربعہ کا گہرا دخل ہے۔ آگ اور پانی کا یہ جلوہ بھی قابل دید ہے:

مانند حباب لب جو جسم کہاں ہے
اک روح ہے تو جامۂ نازک بدنی میں

(مصحفی)

محتاجِ عطر کب ہیں وہ پیراہن بتاں
جوشِ عرق سے جن کی مہکتی ہیں چولیاں

(مصحفی)

نکھر گئے ہیں پسینے میں بھیگ کر عارض
گلوں نے اور بھی شبنم سے تازگی پائی

(غلام ربانی تاباں)

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بہ قدم
رکے رکے سے کچھ آنسو دبی دبی سی ہنسی

(فراق)

واضح رہے کہ محبوب کے جسم کے تذکرے میں چاروں عناصر خود اس میں موجود ہیں جن کی آمیزش سے وہ متشکل ہوا ہے۔ پھر اس کے بعد وہی عناصر اپنے تمام جلال و جمال کے ساتھ جب اس کا لمس حاصل کرتے ہیں تو کیا صورت پیدا ہوتی ہے مصحفی کے دونوں شعروں میں اس کیفیت کو واضح کیا گیا ہے یعنی جسم کو ایسا نہ سمجھو کہ وہ حبابِ لب آبجو ہے یعنی ایک ایسا بلبلہ جو نہر کے کنارے اٹھ رہا ہوتا ہے اور پلک جھپکتے میں پھوٹ جاتا ہے، ایسا نہیں ہے، اس جسم میں جو نازک بدنی کا مرقع ہے اس میں ایک روح بھی موجود ہے۔ دوسرے شعر میں صاف کہا گیا ہے کہ جسم سے اس قدر خوشبو اٹھ رہی ہے کہ محرم بھیگ رہے ہیں، چولیاں خوشبو سے سرشار ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں حسینوں کے پیراہن کو عطر کیا ضرورت ہے۔ جوانی خود اپنے آپ میں ایک پھول ہے۔ وہ جسم جو مٹی، آگ، پانی سے ہی تشکیل ہوا ہے خود میں خوشبو کا بحرِ ذخار ہے یعنی بات یوں ہے کہ:

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

(آتش)

غلام ربانی تاباںؔ کے شعر میں عارض محبوب گل ہیں، پسینہ شبنم ہے، جس طرح وقت سحر پھول اوس میں نہا کر تر و تازہ ہو جاتا ہے اسی طرح اس کے گال پسینے میں بھیگ کر نکھر آتے ہیں یعنی پھول شبنم سے تازگی حاصل کر رہے ہیں۔ دلچسپ پہلو یہی ہے کہ پھول پر شبنم باقی نہیں رہے گی یعنی عارض پر یہ پسینے کی بوندیں نہیں رہ جائیں گی اور گل عارض اس تازگی سے محروم ہو جائے گا جو اس پانی سے حاصل ہو رہی ہے۔ وہ پانی جو خود اس کے اندر سے ہی برآمد ہوا ہے۔ دراصل عارض کا یہی جمال ہے کہ پسینہ خود جسم سے نکلتا ہے اور ان پھولوں کو

نہلا دھلا کر تازہ کر دیتا ہے:

مقدر دیکھئے شبنم کا پھولوں میں ہوئی پیدا
پیام آیا فنا کا جلوۂ نور سحر ہو کر

(چکبست)

بہر حال یہ تو پھول اور شبنم کا فلسفہ ہے کہ کس طرح برگ گل پر قطرہ ہائے شبنم نمود کرتے ہیں، اس کو خنکی و شادابی دیتے ہیں مگر جونہی مہر عالمتاب اپنی کرنیں بھیجتا ہے یہ کرنوں کی عماری میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں مگر آب و خاک، باد و آتش کے پیکر کا جمال کچھ اور ہی ہے، اس پھول کی شبنم اس کے اندر سے ہی طلوع ہوتی ہے اور اس کے جمال جہاں آرا کو سرفراز و بالیدہ کر دیتی ہے۔ میں نے مثال میں فراق کا ایک شعر بھی پیش کیا تھا جس میں محبوب کے جمال کی ایک غیر فانی کیفیت کو سمیٹا گیا ہے یعنی ایک ایسی کیفیت جس میں آنسو بھی ہیں، ہنسی بھی ہے، یعنی آنسو چھلک رہے ہوں اسی عالم میں کچھ کہہ دیا جائے، چھیڑ دیا جائے یا گدگدا دیا جائے تو ہونٹوں سے ہنسی چھلک پڑتی ہے لیکن یہ کیفیت تبسم زیر لب ہی ہوتی ہے جو ایک طرح کی نازک کا بکشاں کے طلوع ہونے کا منظر ہے۔ اس طرح محبوب کا سارا وجود گل بھی ہے شبنم بھی ہے اس میں چہرے کی، رخسار و عارض کی کوئی تخصیص نہیں۔ یہاں آنسو شبنم کا استعارہ ہے جبکہ تاباں کے شعر میں پسینہ تھا لیکن یہاں شبنم بھی ہے جو پھول کی صفت ہے، وہاں عارض کی تخصیص ہے، یہاں سارا جسم شبنم و گل ہے یعنی پیر کے ناخن سے سر کے بالوں تک وہ پھول بھی ہے شبنم بھی۔ قدرے مشترک یہ ہے کہ جس طرح وہاں پسینہ پھول کے اندر سے باہر آ کر عارضوں کو نکھار رہا تھا یہاں آنسو بھی پھول کے اندر سے ہی طلوع ہو رہے ہیں، شبنم کی طرح دمک رہے ہیں، آنسو میں بھی تبسم پنہاں کی کیفیت ہے، فراق کے اس شعر میں عجیب منظر ہے جو جمالیات کے تمام تر عناصر کی گرہیں کھولتا ہے۔ ان تمام اشعار کا حوالہ دینے سے میرا مقصد انور شیخ کی غزلوں کی کیفیات کو ابھارنا کہ ان کے یہاں جمالیات کے کیسے کیسے پیکر ابھر رہے ہیں جس میں آگ، پانی، ہوا، مٹی کی آمیزش، جمال غیر فانی کی تخلیق کر رہی ہے۔ میں ان عناصر کو یہاں تفصیلی طور پر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں:

گوش نازک کو نہ دہکا دے مرا سوز نہاں
چشم پُرنم نے کہا اے گلفشاں صد شکریہ

ان کی شعری تخلیقات کے آٹھ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جو نظم و نثر پر مشتمل ہیں، نبض جہاں، سوز و ساز، آگ اور پانی، راز و نیاز، غزالہ، منظومہ، محبوبہ اور نوائے دل۔ آخر الذکر ان کی غزلوں کا تازہ مجموعہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ کچھ خالص نثری تخلیقات بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اقبال ایک اسلام شکن شاعر، اقبال کا نظریہ عقل و عشق، اقبال کا منفی پہلو، فکر اقبال پر تنقیدی نظر، انور شیخ کے علامہ اقبال پر یہ چار تنقیدی مقالے بڑی تیزی سے اہل علم کی توجہ کے مرکز بن رہے ہیں۔ اقبال پر تعریفی کلمات لکھنے والوں کی تعداد تو بہت ہے لیکن علامہ اقبال کی خامیوں کو اجاگر کرنے والوں کی تعداد اور ان پر تنقید کرنے والے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انور شیخ نے فکر اقبال پر ایک تنقیدی نظر اور اقبال ایک منفی پہلو میں انہیں باتوں کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان میں اقبال کو پیغمبر کا درجہ دیا جا رہا ہے حالانکہ محمد رسول اللہ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، وہ خاتم النبیین تھے اور یہی حقیقت ہے۔''

ساحر شیوی کے مضمون متعلقات انور شیخ (مطبوعہ سہ ماہی رنگ، دھنباد) کے اس اقتباس سے ہم کو بہت سی باتوں کا پتہ چلتا ہے اور اس کا سراغ ملتا ہے کہ انور شیخ کی فکری تہوں کی دبازت کیا ہے اور اس سمندر کا خروش کیا ہے، بس یہ ہے کہ ساحر شیوی کے مضمون لکھے جانے تک انور شیخ کی جو کتابیں منظر عام پر آ گئی تھیں ان کا ذکر کر دیا گیا بعد میں ان کی اور بھی کتابیں آئی ہیں اور یہ تعداد خاصی ہو چکی ہے، اور انہوں نے ایک نئی صنف سخن تلخی بھی ایجاد کی ہے، بہر حال اس تحریر سے اس کا اظہار تو ہوتا ہی ہے کہ انور شیخ آنکھیں بند کر کے چلنے والوں میں نہیں ہیں، وہ تمام موضوعات کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں اور ان سمندروں سے ایسے گوہر آبدار نکالتے ہیں جن کا سراغ ان سے پہلے کسی کو نہیں ملا ہوتا ہے یعنی گوہر آبدار اتھاہ میں سوئے ہونے کے باوجود بھی اپنی درخشانی شناور کے دل و نگاہ تک پہونچا رہا ہے، اس کے رنگوں کے عظیم تموج کا سلسلہ ہے اور یہ چھوٹ تمام کائنات فکر و دانش کو سرشار و تونگر کر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انور شیخ کو مجتہد بھی کہا اور مجاہد اردو بھی، علاوہ ازیں ان کی ایجادات کو

اس شعر میں مٹی تو بنیادی عنصر ہے ہی لیکن خاص عناصر آگ اور پانی ہیں یعنی یہ خوف ہے کہ میرا سوز نہاں جو الفاظ کا پیکر اختیار کر رہا ہے اس کے گوش نازک میں پگھلتی ہوئی آگ کی طرح ٹپک نہ جائے اس لئے یہ کام چشم پرنم سے لیا گیا جو گلفشاں ہے یعنی اشکوں کی شکل میں پھول بکھیر رہی ہے میں اپنے دل کی بات چشم پرنم کی زبان میں کہہ رہا ہوں جو پھول بنکر اس کے گوش نازک تک جا رہی ہے یعنی ایک غیر فانی تازگی کے ساتھ اس کے طشت سماعت میں تراوش کر رہی ہے۔ اس شعر میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ آنسو کی زبان بیحد نرم اور حد درجہ متاثر کن ہوتی ہے کیونکہ اس زبان سے نکلے ہوئے لفظوں کا کوئی پیکر نہیں ہوتا کیونکہ عام طور پر تو لفظ پتھر کی طرح بھی ہو سکتے ہیں، لہولہان بھی کر سکتے ہیں لیکن آنسو جب لفظوں کا پیکر اختیار کرتے ہیں تو وہ لہولہان نہیں کرتے بلکہ دل کو گداز کر دیتے ہیں۔ غالب کی زبان میں ''آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے'' کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ انور شیخ نے محبوب کے دل کو نرم کرنے، اس پارۂ سنگ کو پگھلانے کیلئے آنسو کا استعمال کیا اور یہ کام دیدۂ پرنم کے سپرد کیا کہ وہ اپنے پھولوں کی طرح مہکتے ہوئے لفظوں کو اس کے گوش نازک تک بھیجیں تا کہ اس کے دل کو رام کیا جا سکے۔ ایک اور شعر پیش ہے:

جو دیکھا دل ہے ڈوبا آنسوؤں میں
تو آئے آگ پانی میں لگانے

اس شعر میں دل کا آنسوؤں میں ڈوب جانا، آگ پانی میں لگانا دو محاورے استعمال ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ غم اپنی انتہا کو ہے، دل آنسوؤں میں غرق ہو گیا ہے، یہ بستی غرق ضرور ہے مگر مٹی نہیں، خاک نہیں ہوئی ہے صرف کثرت آب سے اس کے خال وخد نظر نہیں آ رہے ہیں لیکن وہ پانی میں آگ لگا رہا ہے ظاہر ہے کہ بستی کو خاکستر کرنے پر تلا ہے۔ گویا پانی کے خدوخال کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتا ہے، دریا کے نقوش مٹا دینا چاہتا ہے لیکن غم کی آگ تو خود ہی آنسوؤں کے پیکر میں ڈھل کر پانی بن چکی ہے اب اس کے خال وخد غیر فانی ہیں، عشق کی آگ اس کا تماشہ، اس کی جمالیات انور شیخ کے یہاں انتہائی عروج پر ہیں جہاں فارسی کا یہ شعر یاد آتا ہے:

دلم بسوخت تنم سوخت استخوانم سوخت
تمام سوختن و ذوق سوختن باقی ست

(غالب)

انور شیخ کی غزلوں میں آگ کا ذکر خوب ہے، ان کی ایک پوری غزل ہی جوالہ مکھی کی ردیف میں ہے یعنی آتش فشاں کو انہوں نے کس انداز سے پیش کیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ ہماری فارسی اردو شاعری میں آگ ایک بلیغ استعارہ ہے، انتہائی کثیر الجہت، انتہائی کثیر المعانی، ندرت آفرینی کے ہزاروں پہلوؤں سے مزین و تابناک:

یہ عشق کیا ہے ہمیشہ جلنا پگھلنا گرنا نہ پھر سنبھلنا
وہی ہے پروانہ جس کو مرنے میں زندگانی کا لطف آیا

یہ چراغ دل ہے انور جو کرے جہاں منور
کبھی حیرتوں کے مارے یہ دیا جلا کے دیکھیں

آشتی سے زندگانی کا کوئی رشتہ نہیں
ہر نفس آتش فشاں ہے زندگی نوک سناں

برف زماں نہ کرسکی گرمیٔ دل پہ کچھ اثر
میں تو ازل سے آگ تھا آج بھی اک شرار ہوں

جل سکا چراغ دل کب کسی کے نور سے
ہم گئے ملا نہ کچھ پر ضیائے طور سے

ہم نے سمجھا تھا محبت ہے سرور زندگی
درحقیقت یہ تو دل میں ایک چنگاری دبی

آزمائش ہو تو دل پتھر سے بھی ہے سخت تر
بے رخی سے ٹوٹ جاتا ہے مگر مثل حباب

بصد تجسس ملا نہ ساقی پلا سکے جو مئے محبت
سنا تھا ہم نے قدم قدم پر کہ زندگی ہے شراب خانہ

بڑی جستجو سے ملا مجھے یہ سبق نشیب و فراز سے
جو مزا ہے سوز و گداز میں وہ نہیں شراب و کباب میں

آگ محبت کا استعارہ ہے، عشق کا اعلامیہ ہے، زندگی کا نور اور عرفان الٰہی کا ذریعہ بھی ہے لیکن شعلہ خوئی، نرم خوئی، شادابی، طمانیت، سرکشی، کبر یہ تمام چیزیں اس کے رگ و ریشے میں موجود ہیں۔ اگر وہ دلبری میں اپنا جواب نہیں رکھتی تو اس کا انداز غرور بھی دیکھتے ہی بنتا ہے۔ شاید انہیں کیفیات کو شاعر انقلاب نے ان اشعار میں پیش کیا ہے:

بندگی کو نذر استکبار کر دیتی ہے آگ
حکم دیتا ہے خدا انکار کر دیتی ہے آگ
اور اگر چاہو تو فر سروری دیتی ہے آگ
سروری کیا چیز ہے پیغمبری دیتی ہے آگ

(جوش ملیح آبادی)

ان اشعار میں وہ ساری کیفیات موجود ہیں۔ انور شیخ نے آگ کو مختلف رنگوں میں دیکھا انہوں نے ایک ایسے عہد میں آنکھیں کھولیں جہاں آگ اپنے مختلف روپ دکھاتی رہی ہے اور دکھا رہی ہے، شہر جل رہے ہیں تباہ ہو رہے ہیں، انسان جلائے جا رہے ہیں، جلے ہوئے شہروں کی راکھ پورے کرۂ ارض پر بکھری ہوئی ہے۔ یہی وہ شئے ہے جس نے انسان کو ہر طرح کی لذتیں فراہم کی ہیں لیکن انسان نے اس کا منفی استعمال بھی خوب کیا ہے خود اس کے اپنے اندر جو آتش کدے روشن ہیں ان سے اس نے طرح طرح کے کام لئے ہیں، کبھی ذلتوں کے نشیب میں اترا ہے کبھی وہ نیک نامی کے مینار بابل پر متمکن ہوا ہے، آگ انسان کے مزاج کا خاصہ ہے اس کی تخلیق میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، اور اگر ایک طرح سے دیکھیں تو پورا انسانی جسم آگ میں ہی حنوط ہے کیونکہ دیگر تین عناصر تو اس کو سہارا دیئے ہوئے ہیں اس سلسلہ میں آگ سے متعلق ایک یونانی اسطور کچھ اس طرح سے بیان ہوئی ہے کہ پرومیتھیس نامی دیوتا نے عظیم دیوتا قادر مطلق زیوس کے ذخیرۂ نعمت سے آگ چرا کر فانی انسانوں کو دے دی تھی کیونکہ زمستانی موسموں میں وہ سردی سے کانپتے ٹھٹھرتے رہتے تھے، پرومیتھیس کو انسانوں پر رحم آگیا تھا کہ انسانوں کے پاس آگ نہیں ہے، جبکہ دیوی دیوتا اپنے ایوانوں میں بڑے بڑے آتش کدوں کے گرد بیٹھے ہوئے اپنے جسموں کو حرارت میں بگھو رہے تھے اور انسانی

جسم پارۂ برف بنے ہوئے تھے، تبھی پرومیتھیس نے ایک چنگاری چرا کر انسانوں کو دے دی جس کی پاداش میں زیوس نے اسے ایک زمہریری چٹان سے بندھوادیا، اس پر ایک عقاب مقرر کر دیا جو اس کا جگر نوچتا تھا، یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا، تبھی ایک دن پرومیتھیس نے نشیب ارض کی طرف نگاہ کی، وہاں اس نے دیکھا کہ انسانی بستیوں میں آگ لگی ہے جو راکھ کا ڈھیر ہوتی جارہی ہے، وہی لمحہ اس کے احساس گناہ کا تھا، کاش کہ اس نے یہ آگ انسانوں کو نہ دی ہوتی تو وہ اپنی بستیوں کو کیوں جلا کر راکھ کرتے۔ لیکن یہ محض اسطور ہے ورنہ آگ کے بغیر انسان ترقی کی ان منزلوں تک نہیں پہونچ سکتا تھا جہاں وہ آج ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کچھ باک نہیں ہے کہ وہ اپنے تجربات کے لمحوں کو کس طرح فراہم کر پاتا، انور شیخ نے اپنی غزلوں میں آتش فشاں ہونے، شرار و شعلہ ہونے سے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ صاف انسانی جبلت کو ظاہر کرتی ہیں، اس کے تند خو شعلہ خو ہونے کی کیفیات کی مظہر ہیں لیکن انسان بہر حال انسان ہے، اس کے عناصر کثیف بھی ہیں لطیف بھی اور وہ ان چاروں کے مزاج کا اظہار مختلف جہتوں میں کرتا رہتا ہے۔ یہ مناظر انور شیخ کے یہاں کچھ اس طرح ہیں:

ہوئی لذت جستجو جب نہ ہم کو
ہوئی آبجو بیکراں رفتہ رفتہ

جو دھوئے خود کو اپنے آنسوؤں سے
ضروری کیا ہے گنگا میں نہائے

جیسے ٹپکتی چھت ہو مری داستانِ غم
قطرہ کے بعد قطرہ ٹپکتا چلا گیا

دنیا میں آگ پانی کا کیسے ملاپ ہو
تو پیکر جفا ہے تو جان وفا ہوں میں

بجز خزاں فصل گل کہاں ہے فنا جہاں ہے حیات ہوگی
مجھے خبر ہے، شب سیہ میں چھپا ہوا ہے شرار ہستی

آبجو کو بیکراں بنانے کا عمل خاص طور پر شعر اول میں دیکھنے کے قابل ہے ظاہر

ہے کہ لذت جستجو ،شوق جستجو ،شعلۂ جستجو ،منزلوں منزلوں ،بستیوں بستیوں ،شہروں شہروں انسان کو بھٹکاتا ہے، مارا مارا پھرنے پر مجبور کرتا ہے، اس طرح ایک بوند آبجو بناتی ہے پھر آبجو بحر بیکراں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ تجربے کی وہ منزل ہے جہاں انسانی فکر فلک رس کے عظیم الشان اہرام تعمیر ہو جاتے ہیں اور ان کی بلند چوٹیوں پر کھڑا ہو کر جب وہ دنیا کی طرف دیکھتا ہے تو دنیا بیحد خفیف ،حقیر اور بے مایہ نظر آتی ہے، چاروں طرف اس کے سمندر کی بیکرانی ہوتی ہے، اس محیط آب میں چھوٹے چھوٹے جزیرے ابھرتے ڈوبتے ہیں جن میں زندگی متحرک ہوتی ہے۔ انسان اپنی تخلیق میں بیحد عظیم ہے بے حد توانا ہے سرکش ہے لیکن اس کی عقل و دانش کا افق غیر مختتم نہیں۔ تمام کائنات جس میں آگ ،پانی ،ہوا، مٹی کا رقص جاری ہے، عناصر کلیلیں کر رہے ہیں، کلانچیں بھر رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس کے وجود سے نکلی ہوئی ایک مملکت ہی ہے جس کا وہ حکمراں ہے گویا ایک لعل شب چراغ ہے جس کی روشنی خود میں کئی جہانوں کے مناظر کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ روشنی تمام زمانی اور مکانی دیاروں پر محیط ہے اس میں نرم و خنک پھواریں بھی ہیں نرم و شعلہ خیز مست خرام تند رو آبشار بھی ہیں جو خود انسانی زندگی سے ہی وجود میں آئے ہیں۔ گویا خلاق عالم نے پہلے کائنات تخلیق کی پھر انسانی وجود کا کوزہ تخلیق کیا، اس کوزے میں سمندر کو اس طرح بھر دیا کہ وہ اکثر کناروں سے چھلک جاتا ہے۔ ورنہ یہ کیوں کہا جاتا:

زآفرینش عالم غرض جز آدم نیست بگرد نقطۂ ما دور ہفت پرکار ست

(غالب)

یہی ایک نکتہ ہے جو سمجھنے کے قابل ہے کہ انسان کو پیدا کرنے کیلئے اس عالم کی تخلیق کی گئی پھر آگ ہوا مٹی پانی کو سمیٹ کر انسان کو تخلیق کیا گیا اسے وہ جلال و جمال عطا کیا گیا جو فانی نہیں ہے حالانکہ انسان فانی ہے یعنی اسے ایک محور بنایا گیا پھر اس کے چاروں طرف گردش پرکار کی شکل پیدا کی گئی اس طرح وہ تمام کائنات پر محیط ہوا لیکن نکتہ یہ بھی ملحوظ رکھا گیا کہ اسے آب فنا کے ذائقے سے ہمکنار کیا جاتا رہے کیونکہ اس کی ہمیشگی اور جاودانی کائنات کے تنوع پر ایک سوالیہ نشان بن سکتی تھی۔ کیا خوب کہا گیا ہے:

تشنگی میں نے بجھالی یہ ہنر تھا ورنہ
خضر بھی میکدۂ عمر سے پیاسا نکلا

(کوثر جائسی)

ظاہر ہے کہ خضر میکدۂ عمر میں ہونے کے باوجود پیاسا ہے۔ وہ فنا کے جام حیات آفریں کو منھ سے نہیں لگا سکتا لیکن انسان جو ایک بیج کی طرح زمین سے اگھوا بن کر پھوٹتا ہے پھر ایک تناور درخت بن جاتا ہے اثمار شیریں سے سرمایہ دار ہوتا ہے۔ برگ و بار لاتا ہے مسافروں کو سایہ فراہم کرتا ہے تازہ دمی دیتا ہے لیکن رفتہ رفتہ فنا کی آغوش میں اتر جاتا ہے۔ دائمی طور پر پناہ گیر ہونے کے لئے نہیں بلکہ جس طرح زمین کے بطن سے وہ پھوٹتا ہے پھر اسی کے بطن میں لوٹ جاتا ہے تاکہ پھر طلوع ہو سکے۔ یہ عقیدۂ تناسخ نہیں ہے انسانی پیدائش کا اس کرۂ ارض پر ایک عمل ہے جو آگ پانی ہوا اور مٹی سے متمیز ہے۔ اس طرح کائنات کا تنوع برقرار رہتا ہے۔ انسان اپنے خون سے ایک نسل کو جنبش دیتا ہے نمو عطا کرتا ہے پھر وہ نسل دوسری نسل کو جنبش دیتی ہے۔ اسی طرح کائنات میں تخلیق کا عمل جاری ہے۔ ایک روشنی ہے جو اس کے چاروں طرف برس رہی ہے انسان کے ہاتھ میں ہر لمحہ ایک ایسے ترنج زر کی طرح ہے جو طلائے دست افشار کی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ اس کی شان و شوکت، اس کا جلال و جمال خود اس کے عناصر کا فراہم کردہ ہے۔ یہ جلال و جمال کوئی گنج باد آور د نہیں ہے جس پر اس نے قبضہ کر رکھا ہو یا اسے غصب کر لیا ہو بلکہ سب کچھ فطرت کی طرف سے اسے ودیعت ہوا ہے اس طرح ایک آبجو بیکراں ہو جاتی ہے، ایک شرارہ شعلہ بن جاتا ہے، ایک ذرہ ایک جہان کی تعمیر کو سرانجام دیتا ہے اور موج بادرواں تیز آندھی بن کر جنگلوں کے سر توڑ دیتی ہے اور موج آب اگر ہموار زمین پا جائے تو جوئے رواں بن جاتی ہے۔ ایک ایسی جوئے رواں جو انسانی بستیوں کو نگل بھی سکتی ہے۔ رحم دلی اور سفا کی دونوں ہی مزاج فطرت کا حصہ ہیں اور انسان دونوں سے مالا مال ہے۔ اس کی آتش فشانی شہروں کو جلا کر راکھ کر دینے کا ہنر جانتی ہے، اپنے شعور بے پایاں کے تخلیق کردہ نقوش کی رگ رگ میں زندگی بھرنے کا کام بھی وہی کرتا ہے اور انہیں جلانے کا کام بھی وہی کرتا ہے۔ ایثار و قربانی کی منزل میں آئے تو پھر بے شرر و شعلہ جلنے میں بھی اسے کوئی عار نہیں کوئی گریز نہیں خود کو جلا کر راکھ کر سکتا ہے اور اسی راکھ سے دوبارہ زندگی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ یہی اس کا جمال ہے۔ یہی اس کا ادراک ہے۔ مثالاً یہ شعر دیکھئے:

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں
خرام بر فلک و ناز بر ستارہ کنم

(حافظ)

شنیدۂ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم
بہیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

(غالب)

انسان ازل سے ابد تک پھیلے ہوئے منشور کا بانی بھی ہے آفریدہ اور نا آفریدہ جہانوں کا مالک بھی ہے۔ تعمیر و تخریب کا خالق بھی ہے۔ ظاہر و باطن کی تمام روشنی اس کے اثاثوں میں شامل ہے۔ اسی کے دم سے وجود پذیر ہے اور کیفیت یوں ہے "ہر گل کہ دیدم آبلۂ خوں چکیدہ بود"۔ انور شیخ نے ان تمام صورتوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے، انہوں نے وسعت نظر کو بھی ایک جہان تسلیم کیا ہے۔ خود میں کھو کر اسرار وجود حاصل کئے ہیں اس کے بعد وہ دنیا سے اس طرح کلام کرتے ہیں:

سب ہی ہمیں عزیز تھے لمحات زندگی
ہم نے بلند و پست کو یکساں بنا دیا

جو دل میں ہو زباں پر خود بہ خود آتا ہے اے انور
میں شیدائے صداقت ہوں مرا دل چیر کر دیکھو

خدایا عمر تو گزری ہماری فرش پر سوتے
بچھونا تب دیا ہے جب بچھونے کو نہ جی چاہے

ہمیشہ ہی رہا ارماں ہمیں خلوت نشینی کا
ملی جب بزم تنہائی تری یادوں نے آگھیرا

یہ وہ لمحہ ہے جب نگاہیں ایک وسیع افق پر مرکوز ہوتی ہیں وہاں سے زندگی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ عرفان حیات کے شعلوں میں تپ کر زندگی کندن بن چکی ہوتی ہے اور تمام کائنات قدموں میں پڑی لرزتی ہے۔ جہاں بلند و پست یکساں ہوتے ہیں۔ تاریکی و نور میں ایک خط امتیاز کھنچا ہوتا ہے اور فنکار یعنی شاعر خود اپنے وجود کا شناور بن چکا ہوتا ہے۔ آئین شناوری اس کے رموز و غوامض سے وہ واقف ہوتا ہے چونکہ بوند بے کراں ہو جاتی ہے اس لئے اس

کوشناوری میں بے حد لطف محسوس ہوتا ہے۔ ان لمحوں میں وہ تکلیف جہاں گردی نہیں کرتا بلکہ ایک ذرہ اٹھا کر ہی نبض عالم دیکھنے کے شعور سے آشنا ہو چکا ہوتا ہے۔ اس جام آتشیں کے پی چکنے کے بعد ہی اس کی روح کی خلوتوں میں نئی صبح طلوع ہوتی ہے ایک درویشی، بے نیازی اور قناعت اس کے وجود کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں۔ ان لمحوں میں اسے زندگی اور اس کی مادیت سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ ایک نیا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ جمال حیات منکشف ہوتا ہے۔ وہ اشیاء کو دیکھ کر اس کے مزاج و خواص جاننے لگتا ہے۔ انور شیخ کی غزلوں میں اسی ذکار، اسی شاعر، اسی انسان کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کے بحر بے کراں میں ان کے سفینے نے مختلف طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے۔ کبھی باد مخالف انہیں ساحل سے دور لے گئی ہے کبھی باد مراد ان کے سفینے پر مہربان ہوئی ہے۔ بادبانوں سے ہم آغوش ہوتی ہوئی ساحلوں کی طرف لپکی ہے لیکن انہیں مزہ اسی میں آتا ہے کہ وہ طوفان کی زد پر رہیں۔ گردابوں کی زنجیروں میں اسیر رہیں۔ ان کے پیروں میں گرداب بیڑیوں کی طرح پڑے رہیں۔ اگر آب زار ساکن ہو متحرک نہ ہو، اس میں کوئی طوفان نہ ہو تو وہ سفینہ کھینے میں کچھ لطف محسوس نہیں کرتے۔ موجوں کے تھپیڑوں میں رہ کر ان پر زندگی لمحہ لمحہ منکشف ہوتی ہے۔ اس شعر کے مطابق:

اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں

(غالب)

وہ ان ارباب بینش میں سے ہیں جنہیں طوفان حوادث ایک مکتب کی طرح ہوتا ہے یہاں وہ بہت کچھ سیکھتے ہیں، ظاہر ہے طوفان میں موجوں کے تھپیڑے بھی ہیں۔ چنانچہ موج جب انہیں تھپیڑا دیتی ہے تو محسوس ہوتا ہے استاد نے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ سیلی استاد یعنی استاد کا طمانچہ مکتب کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے جو تربیت و تعلیم کی اہم ترین منزل ہے۔ غالب کے اس شعر میں طوفان حوادث ایک مکتب ہے جس میں موج ایک استاد ایک تربیت کار کی حیثیت رکھتی ہے وہ مسلسل تھپڑ لگاتی رہتی ہے اور تھپڑ کا لمس زندگی کے سربستہ رازوں کے انکشافات کا مربوط سلسلہ بنتا چلا جاتا ہے۔

عام طور پر لوگ مشاہیر فنکاروں کی سوانح، خودنوشت یا پھر دوسروں کے تحریر کردہ واقعات پڑھ کر زندگی کے اہم ترین پہلوؤں سے آشنا ہوتے ہیں، لطف پاتے ہیں، تجربہ

حاصل کرتے ہیں لیکن میں ہمیشہ فنکار کے نقوش فن میں ہی اس کی زندگی کو تلاش کرتا ہوں اور بڑی حد تک اس کی اصل تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہوں جہاں سے تخلیق فن کا لمحہ شروع ہوتا ہے۔ فنکار کے یہاں جذبے کا گداز، تجربے کی پختگی خود اس کی زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ شاعر کو اس کے اشعار میں ہی تلاش کرنا چاہئے۔ اسی میں اس کا اصل اور صحیح سراغ ملتا ہے کیونکہ عناصر اس کے نقوش فن میں مختلف رنگ کی دھنک سجاتے رہتے ہیں۔ اس سے جمال حیات، جمال فکر کی تشکیل ہوتی ہے اور وہیں سے پختگی کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ انور شیخ کا کلام پڑھنے کے بعد میں مختلف جہانوں سے روشناس و متعارف ہوا۔ بہت سے رازہائے سربستہ مجھ پر منکشف ہوئے کہ ان کی پوری شخصیت کو میں نے ان کی شاعری میں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ غزل ایک بڑا وسیلہ ہے چنانچہ میں نے ان کی تہوں تک پہونچنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا ہوں۔ چونکہ تخلیق کا دائرہ کبھی محدود نہیں ہوتا اس لئے غزل کی بساط بیکراں سے ہٹ کر انور شیخ کی دیگر تخلیقات کو بھی دیکھا جانا چاہئے مگر غزل کے چاک پر جس انداز سے مختلف وضعوں کے شاہکار انہوں نے تخلیق کئے ہیں وہ کہیں اور نہیں۔ اور یہ بغداد کے حسن کوزہ گر کے ان شاہکاروں کی طرح ہیں جو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی جہاں زاد سے اس کے تعلق خاطر کی یاد دلاتے ہیں۔ تخلیقی عمل سے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے بے حد اہمیت رکھتی ہے جسے انور شیخ کی غزل کے تناظر میں خاص طور سے دیکھا جانا چاہئے:

> ''تخلیقی عمل اصلاً ایک زنجیر ہے جس میں احساس متخیلہ خیال اور لفظ اسی ترتیب سے نمودار ہوتے ہیں۔ بعض اوقات احساس کے اندر ایک طرح کا تلاطم بھی پیدا ہو جاتا ہے اور وہ جذبے کے خروش کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے جس سے تخلیقیت کے عمل میں ناہمواری آجاتی ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو احساس اور جذبہ میں محض مدارج کا فرق ہے۔ دونوں ایک ہی شئے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جب تک احساس لطیف سے لمس کا حامل ہے وہ احساس ہے لیکن یہی احساس جب تند بہاؤ تشنج اور گدلاہٹ کا مظاہرہ کرنے لگے تو جذبہ کہلائے گا، شاعری میں احساس کا کام اپنے لطیف لمس کا مظاہرہ کرتے ہوئے متخیلہ اور

پھر خیال میں ڈھلنا ہے اور وہ گاڑھا اور متلاطم ہو کر جذبے میں منتقل ہو جائے تو اس سے تخلیق کاری کے عمل میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔

اردو ادب کو جذباتی خروش ورثے میں ملا ہے۔ ہم طبعاً جذباتی لوگ ہیں ہمارے یہاں ہنسنے اور رونے کے آداب بھی بلند آہنگ ہیں۔ لطیفہ گوئی اور اس کے نتیجہ میں فلک شگاف قہقہے اسی طرح آہ و بکا اور اس کی بین میں منتقلی دونوں جذباتی خروش کی صورتیں ہیں، بالخصوص شاعری میں جذباتیت کا چلن عام رہا ہے۔ جس سے اسے نقصان پہنچا ہے۔

جذبے کی گداہٹ، تجربے کے خدوخال کو دھندلا دیتی ہے، اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ انتہائی جذباتی حالت میں الفاظ تک لڑکھڑا جاتے ہیں۔ البتہ جب جذبات کا تلاطم مدھم پڑتا ہے اور احساس کی سطح دوبارہ نمودار ہوتی ہے تو سب کچھ جذبے کی گداہٹ میں جو نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا پھر سے دکھائی دینے لگتا ہے اس کی مثال اس ندی سی ہے جس میں اچانک باڑھ آجاتی ہے، پانی تند اور گدلا ہو کر پوری ندی کو کناروں تک اس طور بھر دیتا ہے کہ ندی کی زیریں سطح اور اس کے خدوخال چھپ جاتے ہیں لیکن جب دوسرے لمحے ہی باڑھ کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور شفاف پانی آہستہ روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ندی سے گزرتا ہے تو ندی کے اندر کی ساخت اس کے جملہ نشیب و فراز ہی سامنے نہیں آجاتے بلکہ ان سے گزرتے ہوئے خود پانی کے بہاؤ میں جو ہلکا سا اتار چڑھاؤ آتا ہے وہ بھی آئینہ ہو جاتا ہے، جذبے کا تند بہاؤ بھی ندی کے تلاطم کی طرح ہے، دوسری طرف جب احساس کی آئینہ خرامی تجربے کے اتار چڑھاؤ سے آشنا ہو کر شعر کا جزو بدن بنتی ہے تو شعر میں ایک انوکھی گہرائی، لطافت و سرگوشی کا انداز ابھر آتا ہے۔''

***

گنج رواں کے نام سے تعبیر کیا جو ماضی سے مستقبل تک پھیلے ہوئے ایک منشور سے عبارت ہے اور ادب میں اسی شخص کو اہمیت و مقام حاصل ہے جو فکر و دانش سے کام لیکر کچھ نئے پہلو سامنے لاتا ہے ورنہ تقلید کرنے والوں کی تو ایک طویل قطار ہوتی ہے۔

انور شیخ کی تحریریں مظہر ہیں کہ وہ اقبال کی عظمت کے معترف ہیں، ان کے جذبات سے متموج دل کے قائل ہیں، ان کے بحر تخیل میں اٹھنے والی طغیانی کا بھی انہیں اعتراف ہے لیکن جہاں تک انحراف و اختلاف کا معاملہ ہے وہ کسی سے بھی کیا جا سکتا ہے کسی بھی تخلیق کو تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھنے والا بعض مقامات پر منحرف بھی ہو سکتا ہے، غزل سے متعلق عام خیال رہا ہے کہ یہ حکایت بایار گفتن ہے اور تشریح کیجئے تو حکایت باز ناں گفتن ہے مگر انور شیخ اس سے انحراف کرتے ہیں اور ان کے اس انحراف کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا:

> ''غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنا غلط ہے کیونکہ آج کل عورتیں بھی غزل کہتی ہیں لہذا وہ کس سے بات کرتی ہیں یہ محض لفاظی ہے کیونکہ عورتوں سے باتیں کرنے سے مراد یا وہ گوئی نہیں اظہار محبت ہے، اب وہ زمانہ گزر گیا جب صرف مرد عورتوں سے شادی کی درخواست کرتے تھے، یہ دستور الٹ چکا ہے کیونکہ آج کل عورتیں بھی مردوں کا پیچھا کرتی ہیں اور انہیں محبت بھرے خطوط لکھتی ہیں لہذا غزل کے مضمون میں اتنی وسعت ہے کہ محبوبہ سے مراد محبوب لیا جائے۔ آخر محبوبہ کو غزل کی محبت ہی میں باندھا جاتا ہے اس سے غزل کی صوری و معنوی ہیئت میں بھی فرق نہیں پڑتا اور شاعرات کی مشکل بھی حل ہو جاتی ہے، یہ ویسے بھی عصر حاضر کے اصول مساوات کے عین مطابق ہیں کیونکہ یہ رجحان شاعر اور شاعرہ کو میدانِ غزل گوئی میں ہم پلّہ بنا دیتا ہے۔''

غزل کے متعلق انور شیخ کی یہ رائے دلچسپ بھی ہے اور معنی خیز بھی، بات تو یہ ہے کہ حکایت باز ناں گفتن جیسا فقرہ اگر غزل کیلئے ایجاد کیا گیا تھا تو وہ خاص خطے خاص تہذیب خاص عہد کے لئے تھا ورنہ غزل اپنے میدان میں اس قدر وسیع متنوع اور ہمہ جہت ہے کہ اس کو کسی محاورے یا تمثیل میں قید کیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ میرے نزدیک تمام اصناف سخن میں

انور شیخ کی غزل کا کلاسک سے رشتہ

در فکر آشنائی اہل سخن مباش
باید کہ خویش را بہ سخن آشنا کنی

(غنی کاشمیری)

اساطین ادب کے مائدۂ فکر سے ریزہ چینی ہر ایک فنکار کو ارتفاع فن کی بلند و باوقار منزلوں سے ہمکنار کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس سفر میں غنی کاشمیری کے اس شعر کو زادسفر کی طرح ساتھ رکھنا ہوگا تب جا کر اس دشت بے کنار و لامحدود کو طے کیا جا سکتا ہے۔ مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ اس فکر میں نہ رہو کہ تمہیں بھی اہل سخن میں شمار کیا جائے یا اہل سخن تمہاری طرف توجہ دیں یا تم اہل سخن سے داد کے طالب رہو بلکہ اپنے سخن سے خود مطمئن ہونا، اسے پہچاننا سیکھو اور یہ اطمینان ہو جائے کہ تم نے جو فن پارہ تخلیق کیا ہے اس کی افادیت کیا ہے، اہمیت کیا ہے؟ جب شاعر تخلیق فن کی انتہائی منزلوں تک جاتا ہے تو خود اس کے اندر سے آواز آتی ہے کہ یہ نقش مکمل ہو گیا تاوقتیکہ یہ آواز نہ آئے کہ نقش تکمیل کے شعلے سے ہمکنار ہو گیا ہے جدوجہد جاری رہنی چاہئے، تخلیق فن کے عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑنی چاہئے اور یہی کیفیت تخلیق کار پر اس کے سخن کو منکشف کرنے میں مدد کرتی ہے۔ شعرا اپنے باطن میں انتہائی پیچیدہ ہے لیکن اپنی ہی تخلیق کا عرفان ہونا مشکل ہوتا ہے۔ دیگر شعرا کا کلام تو بساط تفہیم و ترسیل پر خوب درخشاں اور منور نظر آتا ہے لیکن جب اپنی تخلیق ہوتی ہے اور وہ منکشف بھی ہو جاتی ہے تو اس کا حظ کچھ اور ہی ہو جاتا ہے اور شاید یہ وہی سرشاری ہے جو تخلیق کار کو تمام عالم سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں کا المیہ یہی ہے کہ وہ جب خود پر منکشف ہوتے ہیں اپنی تخلیق کے توسط سے تو ان کی درخشانی فزوں تر ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس منزل تک پہونچنے کے لئے جو ریاضت اور مشقت اٹھانی پڑتی ہے وہ خود اپنے

آپ میں ایک چیز ہے۔ تخلیق کار پہلے سے تعمیر کردہ شاہراہوں پر سفر شروع کرتا ہے۔ مختلف قسم کے سنگ میلوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ ہم کلامی کے عمل سے گزرتا ہے لیکن پھر ایک منزل وہ آتی ہے جب وہ خود پر منکشف ہوتا ہے، اپنی شاہراہیں تعمیر کرتا ہے گویا اس کی حیثیت ایک بانی کی ہو جاتی ہے پھر اس کی تخلیق و تعمیر کردہ شاہراہوں پر آنے والی نسلیں اپنا سفر شروع کرتی ہیں یعنی خود کو تلاش کرتی ہیں اور یہی ایک فنکار کا نقطۂ منتہا بھی ہوتا ہے جو آگے جانے والوں کا تھا۔ اس طرح ازل سے ابد تک ایک تسلسل جاری رہتا ہے۔ یہی انسان کا مزاج ہے، یہی اس کی فطرت کا خاصہ ہے اور یہی اس کائنات کا تنوع بھی ہے اور رنگا رنگی بھی۔

ان سطور کو تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غزل کی طویل تاریخ ہے، اس کی شاہراہیں لامتناہی ہیں جسے ہم عرف عام میں کلاسیکیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ان قدیم شاہراہوں کے نقوش ہیں گویا ان شاہراہوں کی تعمیر کرنے والے اب لیجینڈ (Legend) کی شکل اختیار کر چکے ہیں لیکن اسی کلاسیکیت کی زمین سے نئے نئے پودے سر اٹھاتے ہیں۔ نئے نئے نخل اسی مٹی سے طلوع ہوتے ہیں جو نئی نسل کے لئے نقوش بہار ہوتے ہیں، انہیں کے سایوں میں بیٹھ کر ہم ایسی ٹھنڈکوں سے متعارف ہوتے ہیں جو ہمیں جاوداں بناتی ہیں۔

انور شیخ کی غزل کا مطالعہ ہمارے ذہن پر اسی طرح کے انکشافات کرتا ہے کہ اس غزل کے تار و پود فارسی اور اردو شاعری سے ہی تیار ہوئے ہیں۔ فارسی کلاسیک ایک بڑا سرمایہ ہے۔ متقدمین کا کلام ہو کہ متوسطین کا سب ہمارے لئے اکتساب و استفادہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ایک سلسلہ ہے تو پھر اس میں یہ نہیں دیکھا جا سکتا کہ کیا صرف متقدمین سے ہی اکتساب کیا گیا۔ متقدمین کے نقوش سے متوسطین نے استفادہ کیا، متوسطین کے افکار سے متاخرین مکتسب ہوئے۔ اس لئے انور شیخ کی غزل پر اسی حوالے سے بات کرتے ہوئے کہ انہوں نے کہاں کہاں استفادہ کیا ہے یا پھر یہ کہ ان کے افکار کس میدان میں پہونچ کر کہاں کہاں اور اظہارات کی کن کن منزلوں سے گزرے ہیں۔ حتمی طور پر کچھ کہنا یا فتویٰ صادر کرنا قطعی غلط ہے۔ سچا، مکمل اور حقیقی شاعر وہی ہے جو اپنے پورے عہد سے متاثر ہوتا ہے وہ ماضی سے بھی اکتساب کرتا ہے، مستقبل کی بشارتیں بھی دیتا ہے، اپنے معاصرین کے وہ نقوش جو کہیں کہیں تکمیل کا حق نہیں ادا کر سکے ہیں انہیں بھی سمیٹ کر مکمل کرتا ہے۔ اس میں بہت

سے پہلو نکالنا، چراغ سے چراغ جلانا، یہ سب کچھ ممکن ہے لیکن اصل چیز اسالیب کا تنوع ہے جو بنیاد ہے۔ غالب نے فارسی شعرا سے سب سے زیادہ اکتساب کیا لیکن ان پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا:

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

(غالب)

اس خیال کو سب سے پہلے حضرت امیر خسرو نے کہا، پھر میر نے کہا، ناسخ نے بھی کہا لیکن غالب نے اس کے بیان میں جو ندرت پیدا کی وہ کم از کم میر و ناسخ کے یہاں نہیں ہے۔ اسالیب کا تنوع اس نقطۂ نظر سے اہم ہے۔ اردو غزل کا جائزہ لیا جائے تو اس میں سے یہ سب کچھ نکلتا ہے۔

انور شیخ کی غزل میں اسالیب کا تنوع ہے۔ الفاظ کا بے محابہ بے تکلفانہ استعمال ہے جو ان کے معاصرین سے انہیں ممتاز کرتا ہے۔ خاص طور پر ان کی غزل جو کہیں انہیں متقدمین سے الگ بھی کر دیتی ہے۔ ان اشعار کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جانا چاہئے:

تیری زلفوں میں الجھ کر جان من
بڑھ گئی ہے رغبت دار و رسن

مرا نازک بدن شیشہ بوقت مے کشی ٹوٹا
کہ آخر تشنگی میں کام تو جامِ سفال آیا

انہیں چھیڑنا فصل گل میں مناسب
گلوں کو صبا جس طرح گدگدائے

اس سے پہلے کہ میں انور شیخ کے ان اشعار پر قدیم شعراء کے طرز سخن کے حوالے سے بات کروں اور اس پر کچھ روشنی ڈالوں کہ انور شیخ نے اپنا طرز ادا کس طرح ایجاد کیا، اس میں کیا ندرت ہے، کیا ریزہ خیالی، میں مثال میں حافظ شیرازی کا ایک شعر پیش کرتا ہوں جسے قلندر بخش جرأت نے اردو میں اپنے انداز سے باندھا ہے کہ اسالیب کا تنوع واضح ہو گیا ہے:

آسماں بار امانت نہ توانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

(حافظ شیرازی)

لیکن شیخ قلندر بخش جرأت جو اپنے اسلوب میں بے حد متنوع، شوخ اور صاحب طرز شاعر تھے، جنہوں نے میر تقی میر کے سمجھانے کے باوجود چوماچاٹی کی شاعری نہیں چھوڑی اس مضمون کو اس طرح باندھتے ہیں:

نہ سنبھلا آسماں سے عشق کا بوجھ
ہمیں ہیں جو یہ مگدر بھانتے ہیں

یا پھر میر کا بہت مشہور شعر جو زباں زد خاص و عام ہے کہ

جو یونہی تو اے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

یہ شعر کہاں سے آیا ہے، فارسی سے یہ خیال میر نے اٹھایا ہے لیکن اردو میں جس قدر آسان کر کے کہا ہے وہ میر کا ہی کمال ہے۔ خاقانی کا شعر کچھ یوں ہے:

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت خاقانی را دگر شب آمد

(خاقانی)

لیکن بات پہلو نکالنے کی اگر آتی ہے تو پھر خاقانی اور میر کا شعر سننے کے بعد ہمارے عہد کے ایک جدید غزل گو کا شعر بھی دیکھئے کہ جس میں کیسا ندرت آمیز پہلو نکالا گیا ہے:

ہوائے درد کا رخ ہے مرے ہی گھر کی طرف
صدائے گریۂ ہمسائیگاں کہاں جائے

(عرفان صدیقی)

میر نے خاقانی کے شعر کا ترجمہ تو نہیں کیا ہے لیکن بات وہی کہی ہے جو خاقانی نے کہی ہے کہ پڑوسی نے جب میری گریہ وزاری سنی تو بول اٹھا کہ دوسری رات آ گئی مگر خاقانی کا رونا بند نہیں ہوا۔ خاقانی کے شعر میں متکلم پڑوسی ہے جبکہ میر کے شعر میں متکلم وہ خود ہیں۔ کمزوری دونوں شعروں کی یہ ہے کہ جنون عشق میں مبتلا ہونے کے بعد بھی خاقانی کی سماعت تک پڑوسی

کی یہ بات کس طرح پہونچی۔ میر کا جنون عشق بھی بے مایہ ہے کہ وہ خود ہی اپنے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ اے میر اگر تو اسی روتا رہا تو پھر پڑوسی نہیں سو سکے گا۔ گویا جنون عشق میں پڑوسی کے آرام کا خیال موجود ہے، دونوں کے یہاں گریہ وزاری ہے لیکن ہوش وحواس کے ساتھ اس لئے جنون عشق مکمل نہیں۔ جس طرح غالب نے فرہاد کے اس عمل پر اعتراض کیا ہے کہ پیرزن کی زبان سے مرگ شیریں کی خبر سن کر تو فرہاد کا دم نکل جانا چاہئے تھا کجا یہ کہ اس نے یہ خبر سنی تیشہ اٹھایا اور اپنے سر پر مارا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنون عشق مکمل نہیں تھا۔ فرہاد ہوش میں تھا۔ مرگ شیریں کی خبر سننے کے بعد اس نے خودکشی کا ارادہ کیا اور تیشہ مار کر مر گیا:

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

(غالب)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس سطح پر خاقانی اور میر کے اشعار میں کیا کمی واقع ہوئی ہے۔ میں نے کچھ دیر پہلے غالب کے ایک شعر کا حوالہ دیا تھا، سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں، اور یہ بھی بتایا تھا کہ بنیادی خیال امیر خسرو کا ہے۔ میر وناسخ کے کہنے کے بعد غالب نے اس خیال کو باندھا تھا لیکن اسلوب کا تنوع صرف غالب کے یہاں ہے۔ نمونتاً خسرو میر اور ناسخ کے اشعار بھی دیکھ لیجئے:

اے گل چو آمدی ززمیں گو چگونہ اند
آں روئے ہا کہ در تہہ گرد فنا شدند

(امیر خسرو)

ہیں مستحیل خاک میں اجزائے نوخطاں
کیا سہل ہے زمیں سے نکلنا نبات کا

(میر)

ہوگئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

(ناسخ)

غالب کا شعر آپ سن چکے ہیں لیکن ہمارے عہد کے ایک صاحب طرز جدید شاعر نے اسی مضمون میں کیا خوبصورت پہلو نکالا ہے جس میں امیر خسرو کے خیال کو توسیع دی ہے وہ خیال جس کی صرف تقلید میر و ناسخ نے کی ہے۔ شعر یوں ہے:

مدفوں ہیں زمیں میں کئی صاحبِ جمال
اے صاحب جمال ذرا دیکھ بھال کر

(محمد علوی)

یہ مثالیں دینے کا مقصد یہ ہے کہ پرچھائیوں کی تلاش، عکسوں کی جستجو، اسالیب کا تنوع کس طرح انور شیخ کے یہاں آیا ہے، ان کا خیال ہے کہ زلفوں میں الجھنا دار و رسن کی رغبت پیدا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ایک زنجیر ہی ہے، زنداں بھی ہے اور اس کا تمام اہتمام بھی ہے۔ اب اوسط درجے کے ایک غزل گو شاعر کا یہ شعر دیکھئے:

اب یہ زنجیر رہے پائے جنوں کی زینت
سلسلہ ختم ہوا زلف گرہ گیر کے بعد

(ندرت کانپوری)

لیکن ایک جدید غزل گو نے اسی خیال کو کس خوبصورت انداز سے پیش کیا:

یوں تو ہیں بہت جال مگر اے دلِ ناداں
پہلے تو تجھے زلف کے پیچاک سے لے آؤں

(عرفان صدیقی)

انور شیخ نے کہا ہے کہ جام سفال میرے اس نازک بدن شیشے سے بہتر ہے جو مئے کشی کے وقت ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ سرمستی کے عالم میں اس کا خیال رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شیشہ نازک ہوتا ہے اور وہ ان چار عناصر میں سے نہیں ہے جو انسان کی تخلیق میں کام آئے ہیں اور سفال چونکہ انسان کی تخلیق کا جزو اعظم ہے وہ بڑی حد تک انسان کی سرمستی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بدمستی کا متحمل ہوتا ہے۔ غالب نے بھی جام سفال کو جام جم سے بہتر بتایا ہے کیونکہ جام جمشید یا جام جہاں نما دراصل شیشے کا ہی تھا اور اتنا بیش قیمت تھا کہ ٹوٹ جانے کے بعد اسے دوبارہ مہیا کرانا مشکل تھا اور جام سفالیں تو بہر حال فراہم کرایا جا سکتا ہے:

اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا جام جم سے یہ مرا سفال اچھا ہے
(غالب)

لیکن وہ رندی اور سرمستی جس کا ذکر غالب نے اپنے شعر میں کیا ہے اور انور شیخ نے بھی کیا ہے اس کو نئی کاشمیری کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں:

بہ بزم مے پرستاں سرکشی برطاق نہ زاہد
کہ می ریزند مستاں بے محابا خون مینارا

محبوب کو گدگدانے کا انداز انور شیخ کے یہاں غزلوں میں خوب ہے اس میں بیبا کی بھی ہے شوخی بھی ہے شرارت بھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس وقت معشوق کو گدگدایا جائے جب صبا غنچوں اور کلیوں کو گدگدا رہی ہو گویا اس کے لئے انہوں نے ایک موسم مقرر کیا ہے جو انسان کی سرمستی سے تعلق رکھتا ہے اور گویا ایک طرح سے صبا کی تقلید کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ چمن میں اس طرح کے مناظر ظہور پذیر ہو رہے ہیں اور عاشق کو بھی معشوق کو گدگدانے کی ترغیب دے رہے ہیں لیکن غزل کے وسیع افق پر دیکھیں تو چمن کی صبا کی تقلید کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ مثال دیکھئے:

گدگدائے نہ بنے ہاتھ لگائے نہ بنے
بن کے لیٹی ہو جوانی تو اٹھائے نہ بنے

(شاد عارفی)

ہمارے اساطین ادب کا یہ خیال ہے کہ کلاسک ایک زمین ہے جس کی مسلسل کھدائی جاری رکھنی چاہئے کیونکہ اس میں بیش بہا خزانے ہوتے ہیں اور خزانے کبھی کم نہیں ہوتے ہیں۔ انور شیخ بھی اس راز سے واقف ہیں کہتے ہیں:

جفا یا اک ادا تھی ہائے شوخی سے کہا اُس نے
تمہیں پانا نہ ہم چاہیں اگر کھویا خزانہ ہو

محبوب کی بے اعتنائی، اس کے تجاہل عارفانہ کا ذکر ہماری اردو غزل میں بھرا پڑا ہے۔ یہ انداز انور شیخ نے بھی اختیار کیا ہے اور خوب خوب تصویریں بنائی ہیں۔

یقیناً سوز مجنوں کے سنے ہیں تم نے افسانے
اگر جاں تم میں جرأت ہو ہمارے دل پہ دستک دو

ظالم نے ہاتھ کھینچا میں نے اگر بڑھایا
یوں ہر گھڑی ستایا میں پھر بھی خندہ زن ہوں

غضب ہے مہ رو رقیب کے گھر ہمیشہ ہی بن بلائے جاؤ
بلائیں ہم تو کبھی نہ آؤ تمہارے دل میں جو تم ہی جانو

ہوتا نہیں اثر کچھ تیر نظر کا تم پر
آنکھیں لڑا لڑا کر اے یار تھک گیا ہوں

کروں تعریف محبوبوں کی پاؤں گا کہاں اکثر
عجب یارو ہے یہ منصب کہ میں تو مرد ناداں ہوں

سر راہے ملو تو دھول دھپے پر اتر آؤ
کہ تم ہو مہرباں پیارو تصور ہی تصور میں

بن چکے ہیں اب خس و خاشاک ہائے کیا ہوا
تھے حسینوں کے گل تر دل اگر دیتے نہ ہم

گالیاں بکواس دھمکی سب نشاط انگیز ہے
درحقیقت اک مزا ہے آپ کا طرز بیاں

محبوب سے چھیڑ چھاڑ کا یہ انداز ان کی غزل میں قدیم غزل کی پرچھائیوں کی طرح در آیا ہے۔ دراصل فارسی اور اردو غزل کی کلاسیک کی یہ ایک عطا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس قدر عمیق مطالعہ کیا گیا ہے تو اس کے اثرات ضرور نمایاں ہوں گے جو زندگی کے تمام نشیب و فراز پست و بلند کو خود میں سمیٹنے کا اہتمام کریں گے۔ انور شیخ کی فکر شعلہ خیز کے رگ و ریشہ میں مشرقیت کا زبردست حسن موجود ہے اور ہے بھی یہی لطیف تصور کہ محبوب ایسا ہی ہو جیسا کہ مشرق میں متصور کیا جاتا ہے۔ لیکن تہذیب عالم کی ایک آویزش بھی حجاب لفظ میں ان کی غزل

کے جمال کو دوبالا کرتی ہے۔ اگر چہ بہت کچھ پردۂ خفا میں رہتا ہے مگر شعر کی قرأت کے وقت تمام اتار چڑھاؤ تمام زیر و بم سامنے آجاتا ہے اور اس کلاسیک سے جا کر مل جاتا ہے جو ایک مواج سمندر کی طرح کراں تا کراں اپنے تشخص کا اظہار کر رہا ہے اور جہاں اس طرح کے رنگ نظر آتے ہیں:

غیر نے تم کو جاں کہا سمجھے بھی تم کہ کیا کہا
یعنی کہ بے وفا کہا، جان کا اعتبار کیا

(سودا)

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگے دن ہے ابھی رات کے وقت

(انشاء)

لگ جا گلے کہ طاقت اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

(جرأت)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(مومن)

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(مومن)

آپ کی محبت میں جو بہا تھا آنکھوں سے
آپ کی بلا جانے خون تھا کہ پانی تھا

(ندرت کانپوری)

کوستا ہوں جو نصیبوں کو تو کہتا ہے وہ شوخ
پھر محبت نہ کرے گا اگر انساں ہوگا

(داغ)

جاں نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

(مومن)

وصل میں ایسے سے ڈھونڈے کوئی کیونکر واشد
جس نے سو ناز سے اک بند قبا باز کیا

(مصحفی)

نشۂ رنگ سے ہے واشد گل
مست کا بند قبا باندھتے ہیں

(غالب)

ہر چند کہ تھا قابل دیدن بدن اس کا
پر آنکھ نہ ٹھہری جو کھلا پیرہن اس کا

(مصحفی)

انور شیخ فکری طور پر ان تمام مناظر کو سمیٹتے ہیں۔ انہیں محبوب کا ساتھ اس قدر عزیز ہے کہ اس کی بے اعتنائی بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ بہر حال عشق میں تو یہ سب ہوتا ہی ہے۔ عاشق کو سب کچھ سہنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر لمحۂ مراد ہاتھ آتا ہے۔ قدیم اردو غزل میں عاشق معشوق کے محمل کے ساتھ چلتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ساربانوں کا کردار بھی ادا کرتا تھا۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے:

ناقۂ حسن کی ہمرکابی کہاں خلوتِ ناز میں باریابی کہاں
ہم کہ اے بانوئے کشورِ دلبری پاسداروں میں ہیں ساربانوں میں ہیں

(عرفان صدیقی)

انور شیخ کے یہاں بھی محبوب ظالم ہے۔ ستم شعار ہے۔ عاشق ہاتھ بڑھاتا ہے وہ ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ اک تغافل سے کام لیتا ہے۔ منہ پھیر کر مسکراتا ہے۔ کبھی کبھی اسے دروازے سے بھگا بھی دیا جاتا ہے لیکن شاہد ان خوش اندام کی ان دل ستاں اداؤں پر بھی عاشق کی جان جاتی رہتی ہے۔ غالب نے شاید اسی نکتہ نظر سے یہ شعر کہا تھا:

سب سے مشکل صنف غزل ہے، کتنی ہی اصناف سخن آئیں، عصری تقاضوں کے ساتھ پیدا ہوئیں، ختم ہوگئیں اور یہ سلسلہ جاری رہے گا، ادبی اصناف طلوع ہوں گی پھر ماضی کے نہاں خانوں میں پناہ گیر ہو جائیں گی لیکن غزل اپنے اسالیب کے تنوع کے ساتھ زندہ رہے گی۔ غزل ایک ایسی صنف ہے جو ہیئت میں بھی تبدیلی گوارا نہیں کرتی، آزاد غزل کا بڑا چرچا رہا لیکن اب وہ کہاں ہے؟ اس کے بانی اسے تادیر زندہ نہیں رکھ سکے۔ انور شیخ اس راز سے چونکہ واقف ہیں اس لئے انہوں نے غزالہ کو جنم تو دیا لیکن اسی طمطراق سے جو کہ غزل کا طرۂ امتیاز ہے، ان کا یہ نظریہ کہ غزل مردوں تک محدود نہیں ہے بڑی حد تک قابل قبول ہے ویسے بھی میں حکایت بایار گفتن کو تو غزل میں کسی حد تک گوارا کر لیتا ہوں چونکہ ہمارے یہاں یہ لفظ کثیر الجہت معنی رکھتا ہے لیکن حکایت بازناں گفتن یہ محض لکھنؤ اسکول کی ایجاد ہے جو نہ پہلے کبھی فعال اور مؤثر تھی اور نہ اب ہے۔

میں ایک بار پھر اپنے موقف کو دہرانا چاہوں گا کہ اس کتاب میں میرا موضوع انور شیخ کی غزل کا تنقیدی اور تقابلی مطالعہ ہے اور میں ان کی غزل کے ہی خوشنما و دلفریب رنگ زاروں کی سیاحت پر نکلا ہوں لیکن اجمالاً یہ لازم ہے کہ میں ان کی دیگر فکری و تخلیقی جہات کا جائزہ لوں پھر باقاعدہ غزل کی طرف اپنے رخش قلم کی باگ موڑوں، میں سب سے پہلے ان کی شعری اصناف کی بات کرتا ہوں جو ان کی ایجادات میں شامل ہیں ان میں کسی حد تک مکالمہ اور تمثیلچہ بھی ہیں حالانکہ اس کی مثالیں دوسروں کے یہاں بھی ہیں لیکن جو بیباکی و دراکی، طنز ملیح انور شیخ کے یہاں ہے کہیں نہیں ہے، ان کی فکشن نگاری کا میں ذکر بعد میں کروں گا کیونکہ یہ بھی ان کے یہاں وسیع وضوفشاں تخلیقی جہت ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ انور شیخ کی ایجاد کردہ شعری اصناف کی تعداد آٹھ ہے، (۱) تکونی (مارچ ۱۹۹۸ء)، (۲) کہمن (اکتوبر ۱۹۹۸ء)، (۳) غزالہ (اپریل ۱۹۹۹ء)، (۴) متضاد نظم (جون ۱۹۹۹ء)، (۵) منظومہ (اگست ۲۰۰۱ء)، (۶) محبوبہ (نومبر ۲۰۰۱ء)، (۷) مکرولی (جنوری ۲۰۰۲ء) اور (۸) تلخی (۲۰۰۳ء)، یہ تمام اصناف سخن ۱۹۹۸ء سے لے کر ۲۰۰۳ء کے اندر ہی ایجاد کی گئی ہیں یعنی کم و بیش چار سال کے اندر۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں کس قدر ندرت آفرینی ہے اور بدرجۂ اتم زرخیزی ہے ظاہر ہے کہ انور شیخ کی انگریزی اردو نظم و نثر تصانیف کی جو تعداد ہے وہ یہی ثابت

جس قدر بھی ذلت ہو ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

جس طرح غالب کی انگلیاں فگار ہیں۔ خامہ خونچکاں ہے۔ اسی طرح انور شیخ کے یہاں بھی یہی سب کچھ ہے مگر اس کا انداز کچھ اور ہے۔ غالب اپنی تمام تر بلا رقیب کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ محبوب کے لبوں کی شیرینی کی تعریف تو کرتے ہیں مگر ان شیریں لبوں سے گالیاں رقیب کے لئے نکلتی ہیں ان کے لئے نہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے گالیاں خود انہیں کے لئے ہوتی ہیں لیکن وہ یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ رقیب کو گالیاں دی گئیں اور وہ بے مزا نہیں ہوا۔ یہ محبوب کے لبوں کی شیرینی کا کمال ہے۔ انور شیخ نے اپنا منصب یوں تخلیق کیا ہے کہ میں مرد ناداں ہوں۔ گالیاں کھاتا ہوں مگر محبوبوں کی تعریف کرتا ہوں ظاہر ہے کہ اس میں پوشیدہ ایک نفسیاتی نکتہ یہ ہے کہ تعریف سے گالیاں ملتی ہیں ان گالیوں میں قربت کا ایک خاص انداز ہے، جسے زیادہ اپنا سمجھا جاتا ہے اسی کو سب کچھ کہا جاتا ہے یہ کوئی انتقامی جذبہ نہیں ہے۔ بے اعتنائی نہیں ہے۔ دراصل یہ ایک طرح کی ''نہیں'' ہے جس میں ''ہاں'' پوشیدہ ہے۔ انور شیخ حسن کے مزاج داں ہیں وہ اسے خوب سمجھتے ہیں جس قدر محبوب گالیاں دیتا ہے اسی قدر اس کی تعریف کرتے ہیں لیکن بعض لمحوں میں وہ یہ بھی سوچتے ہیں کیا میں مرد ناداں ہوں حالانکہ وہ مرد دانا ہیں مرد ناداں نہیں کیونکہ وہ محبوب کے طرز بیان کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں محبوب کا اس طرح کا لہجہ جس میں گالیاں، بکواس، دھمکیاں ہوں نشاط انگیز ہے۔ اس معاملے میں وہ مومن، داغ اور کسی حد تک امیر مینائی کے اسکول سے متعلق نظر آتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ فکری اکتساب بھی کرتے ہیں:

منھ تو دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

(امیر مینائی)

ظاہر ہے کہ جب تعریف کے جواب میں گالیاں ہی مل رہی ہیں تو پھر سب کچھ کیوں نہ کہہ دیا جائے۔ جھجھک کیسی، تکلف کیا ہے۔ کیا یہ بزدلی نہیں ہے کہ محبوب رقیب کو گالیاں دے رہا ہے مجھے نہیں۔ اگر عاشق ہونے کا دعویٰ ہے تو پھر گالیاں، دشنام طرازی، بے اعتنائی ان

تمام باتوں سے مصالحت کرنا پڑے گی۔ انور شیخ کے یہاں محبوب سراپا ہے دھول دھپے پر اتر آتا ہے۔ غالب کے یہاں بھی دھول دھپا ہے لیکن غالب ایک متکلم ہونے کی حیثیت سے یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ وہ دھول دھپے پر کیوں اتر آیا تھا۔ پھر ان کے یہاں دھول دھپہ خلوت میں ہے جلوت میں نہیں۔ اس کو کسی نے دیکھا بھی نہیں انہوں نے محبوب سے پیش دستی کی تھی اور محبوب نے دھول دھپے سے کام لیا تھا ''تم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن،، یہ کہکر انہوں نے خود کو جرم کار قرار دیا ہے۔ یہ بھی پہلو ہے کہ وہ پیش دستی کر کے محبوب کو دھول دھپے پر اکسا رہے ہوں تا کہ دھینگا مشتی، کھینچا تانی کا بھی لطف اٹھایا جا سکے۔ انور شیخ کے یہاں دھول دھپا سراپا ہے۔ یہ ان کے حقیقت پسند ہونے کی دلیل ہے۔

عشق کی اس منزل میں جب جنوں اس کمال کو پہونچ رہا ہو سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ محبوب کو مشورے دیئے جا سکتے ہیں، اپنا حال کہا جا سکتا ہے، خواہ وہ سنے یا نہ سنے، توجہ دے یا نہ دے۔ متقدمین نے اس طرح کے مضامین یوں باندھے ہیں:

جی کھول کے افسانۂ غم کیوں نہ سنالوں
اب تو ترے ماتھے پہ شکن آ ہی گئی ہے

(ندرت کانپوری)

حکایت شب غم ان کو اک کہانی تھی
کچھ اعتبار کیا کچھ نہ اعتبار کیا

(داغ)

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

(سیماب)

ایسا بھی نہیں ہے کہ انور شیخ نے غزل کو کسی ایک معنی یا ایک محور پر رکھا ہو۔ داخلی اور خارجی تمام کیفیات ان کے یہاں موجود ہیں۔ زبان و مفاہیم کا تنوع بھی ہے غزل کی زبان کا مستقل یا حتمی کوئی اصول نہیں ہے۔ میں اس صورت حال کو کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ کون سا لفظ غزل کا ہے اور کون نہیں۔ ہر لفظ غزل کا ہے بس اس کا تخلیقی استعمال ہی اہمیت کا حامل ہے۔

چنانچہ انور شیخ کے یہاں یہ کیفیت ہے اور یہ فن انہوں نے اساتذۂ قدیم سے سیکھا ہے یہاں غزل کو لفظوں میں قید نہیں کیا جاتا تھا۔ زبان کا انتخاب جذبات واحساسات کے عین مطابق کیا جاتا تھا۔ اسی لئے ان کی غزل گوئی کامیاب تھی۔ یوں بھی غزل کا افق بے حد وسیع ہے۔ معنویت کی نئی نئی جہات غزل کا نقطۂ امکان وانتہا ہیں۔ زبان کا بھی اعلیٰ شعور شاعر کو اپنے معاصرین میں ممتاز ومنفرد بناتا ہے اور رنگ سخن کو دوام بخشتا ہے۔ حالانکہ شعرالعجم میں شبلی نعمانی نے بعض باتیں اردو غزل کی فارسی غزل سے متصف کردی ہیں لیکن میں اس نکتہ سے اتفاق نہیں رکھتا کہ اردو غزل خود فارسی غزل کی پیروی کرتی ہے۔ اسی انداز اور اسی ڈکشن میں بات کرتی ہے۔ بس بعض مقامات پر وہ قدرے مختلف ہوجاتی ہے۔ اس طرح اردو غزل فارسی غزل کی ایک دلنواز پرچھائیں ہے۔ ہندوستان میں فارسی کا ایک بڑا عہد تھا اگر آج فارسی غزل ہوتی تو یقینی طور پر اس غزل میں آج کا عصری شعور نمایاں ہوتا لیکن جہاں کہیں بھی ہے اس میں عصری شعور موجیں مارتا ہے۔ اس کو اپنے عہد سے متصف کرتا ہے۔ جس طرح آج اردو غزل کا مزاج بدل گیا ہے۔ ایران میں فارسی غزل نے بھی اپنا پیرہن بدل لیا ہے یعنی اس کی نوا کے شجر نے اپنی قبائے کہنہ اتار دی ہے کیونکہ باغ میں جو رُت ہے وہ نئی تہذیبی اقدار کی حامل ہے۔ میں شبلی نعمانی کی اس تحریر کو پیش کرتا ہوں جو شعرالعجم سے لی گئی ہے لیکن فارسی غزل کے حوالے سے جو باتیں کہی گئی ہیں وہ پہلے کبھی اردو غزل میں ہوتی تھیں آج نہیں ہیں۔ اس تحریر کا اولین حصہ یوں ہے:

''عشق کی حقیقت، اس کا اثاثہ محبوب کی کج ادائیاں، بدعہدی، رقیب، واردات عشق محبوب کا ظلم، اخفائے حال، رقیب کی موت، معشوق کی مخفی نظر، لطف معشوق کی مخفی آزردگی، محویت کا عالم، معشوقانہ ناز، عاشق کی بے خبری، معشوق کا دوسرے پر عاشق ہوجانا، شب ہجر۔ ان میں سے کچھ ہی باتیں ہیں جو آج کے عشق میں نہیں ہیں ورنہ سبھی کچھ ہے۔ کیونکہ عشق انسان کی فطرت، جذبہ اور احساس سے تعلق رکھتا ہے ہاں یہ ضرور ہے بقول شاعر:

اب غزلوں میں سر پھوڑ کے مرتی نہیں لیلیٰ
اب اٹھ کے نہیں بھاگتے عشاق لحد سے

(فضیل جعفری)

لیکن فضیل جعفری کے یہاں عشق کی یہ کیفیت بھی بیان کی گئی ہے جو ہمیشہ رہے گی اور انسانی جذبہ سے اس کا گہرا تعلق ہے:

بادۂ درد خم اشک کتاب گریہ
ہم نے سامانِ سفر حسب مشاغل باندھا

(فضیل جعفری)

ظاہر ہے کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ وہ دور ختم ہو چکا ہے۔ تہذیبی قدریں بھی بدل گئی ہیں۔ عشق کی قدروں میں بھی انقلاب آیا ہے۔ لہذا غزل کا اس سے متاثر ہونا فطری ہے لیکن جہاں تک معاملات حسن و عشق کا سوال ہے وہ قدریں اب بھی وہی ہیں۔ آج بھی اسی طرح نگاہیں ملتی ہیں۔ قربتیں فروغ پاتی ہیں۔ جسموں کا اتصال ہوتا ہے۔ عناصر کو سکون وطمانیت حاصل ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آنکھیں ملنے سے لیکر اتصال جسم تک پہلے بہت دشوار منزلیں ہوا کرتی تھیں اب قدرے آسان ہوگئی ہیں۔ حالانکہ محبوب کی ادائیں اس کے عشوؤں کی فوج چونکہ اس کی فطرت سے تعلق رکھتی ہے اس لئے وہ آج بھی موجود ہے۔ عاشق کو تڑپانا، دوسروں سے ہنس ہنس کے باتیں کرنا۔ دراصل اس میں بھی محبوب کے مزاج کی ایک پوشیدہ شرارت ہے، ایک ادا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ جہاں تک غزل میں بوالہوسی کا سوال ہے وہ پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے۔ پہلے وہ بوالہوسی قابل اعتراض تھی۔ تہذیب کا ایک منفی پہلو تھا۔ آج اسے تہذیب کا ایک حصہ مان لیا گیا ہے لیکن پرانی کئی رسمیں جو عاشق و معشوق کے درمیان ہوا کرتی تھیں وہ اب ختم ہو چکی ہیں یعنی کہ آج کے عاشقوں کو قاصدوں کی ضرورت نہیں ہے، بات بھی ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کا سامنا بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے غزل سے قاصد کہیں غائب ہو گیا ہے۔ اب تو صورت حال یہ ہے:

اڑ گئے نامہ بر کبوتر آج
سونپ کر راز برق پاروں کو

(کیفی اعظمی)

اس لئے عشق کی قدروں میں اب تبدیلی آچکی ہے۔ انسانی معاشرہ بھی تقلیب و تنسیخ کے عمل سے گزر رہا ہے لیکن عشق چونکہ ایک فطرت ہے، جبلت ہے، وہ کسی نہ کسی طرح سے قائم رہی

ہے اور قائم رہے گی۔ انور شیخ نے اس طرح کے عشق کا جو مشرق و مغرب کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے ایک خوبصورت آمیزہ تیار کیا ہے اور ان تمام باتوں کا بہت خیال رکھا ہے۔ غزل میں متقدمین نے محبوب کے چلمن سے جھانکنے، کوٹھے پر آنے کا بہت ذکر کیا ہے حالانکہ اب چلمن میں بیٹھنا کوٹھے پر آنا تقریباً ختم ہو چکا ہے لیکن قربت کسی بھی عالم میں ہو اس کا منتہا ایک ہی ہے یعنی جسموں کا اتصال جس طرح پہلے تھا آج بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ فارسی شاعری میں ایرانی تہذیب کا عکس نظر آتا ہے جو ایران کی خاک سے اٹھے تھے ان کے یہاں بھی اور ان فارسی گویوں کے یہاں بھی جو ہندنژاد تھے لیکن کئی ایرانی شعرا کے یہاں ہندوستانی تہذیب کے بھی جلوے نظر آتے ہیں کیونکہ بہر حال ہندوستان اور ایران تہذیبی طور پر ایک دوسرے کے مماثل بھی ہیں اور قدرے مختلف بھی۔ مثلاً شیخ علی حزیں اصفہانی اپنے وطن اصفہان سے جو ایران کا ایک تاریخی شہر ہے، ہندوستان ہجرت کر کے آئے پھر واپس نہیں گئے۔ ان کی مادری زبان فارسی تھی۔ انہیں اپنی فارسی دانی پر ناز تھا اور ہونا بھی چاہئے۔ فارسی گویان ہند کی ان کی نگاہ میں کچھ اہمیت نہیں تھی۔ کسی نے ان سے مرزا محمد رفیع سودا کی فارسی شاعری کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ، در پوچ گویان ہند بہتر است،، یعنی ہندوستان میں مہمل کہنے والوں میں سودا بہتر ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رائے اُردو کے لئے نہیں تھی کیونکہ شیخ علی حزیں اردو شاعری کے مزاج سے قطعاً واقف نہیں تھے۔ صاحب طرز فارسی گویوں میں حزیں اور بیدل دو ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اردو میں بھی کچھ نوچ کھسوٹ کی ہے مگر منھ کے بل گر پڑیں ہیں یعنی بقول غالب ان کی ''ٹھیک'' نکل جاتی ہے۔ وہ زمانہ اردو کا ابتدائی زمانہ تھا۔ فارسی کا سکّہ اقلیم ہند ہی نہیں بلکہ دنیا کے کئی حصوں پر چل رہا تھا اس لئے ضرورت بھی کیا تھی کہ شیخ حزیں اردو میں شعر کہتے لیکن ہندوستان کی زرخیز فضا سے وہ اس قدر مانوس ہوئے اور خاص طور پر بنارس کے حسن سے اتنا متاثر ہوئے کہ واپس ایران نہیں گئے اور کہہ اٹھے:

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن پسر لچھمن و رام است ایں جا

ظاہر ہے کہ شیخ حزیں ایرانی تھے برہمن زادوں پر اس طرح عاشق ہوئے کہ تا عمر شادی نہیں کی۔ بنارس میں ہی وفات پائی اور وہیں کی خاک میں آج بھی آسودہ ہیں۔

پس ظاہر ہوا کہ ایرانی غزل کے موضوعات میں وہ رنگ نہیں ہے جو ہندوستان کی فارسی غزل میں ہے کیونکہ یہ دو تہذیبوں کا آمیزہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب ببانگ دہل کہہ رہے ہیں:

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو بے رنگ من است

لیکن جس قدر غالب کے یہاں نرمی ہے، شیرینی ہے، حلاوت ہے، خاص طور سے ان کے فارسی کلام میں اسی قدر شیخ علی حزیں اصفہانی کے یہاں صورت حال بے حد سنگلاخ ہے۔ نمونتاً ایک شعر پیش کرتا ہوں

بہارِ عکس رویت درچمن جوشے زدو گل شد
فغاں از سینہ ام برخاست شکل بست وبلبل شد

میں اگر اپنی اس تمام تحریر کو سمیٹ لوں تو بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ انور شیخ نے فارسی اور اردو غزل خاص طور پر کلاسیک سے جو استفادہ کیا ہے وہ اہم ہے مگر خاص بات یہ ہے کہ اس رنگ کو انہوں نے اپنے اوپر چڑھنے نہیں دیا ہے بلکہ اپنا رنگ سخن ایجاد کیا ہے یعنی ہر شعر میں ان کے اپنے اسلوب کا تنوع قاری سے ہم کلام ہوتا ہے اور ان کا ہر شعر اس کیفیت سے مالا مال ہے۔ وہ ایک ایسی سرزمین سے پیدا بھی ہوئے ہیں جہاں علم کی بلاغت بھی ہے، فنون کی عظمت بھی ہے، ثقافت کی بلندی بھی ہے اور فضاؤں میں آزادی اور حریت کی خوشبو بھی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار پڑھ کر یہ شعر بے اختیار یاد آتا ہے:

عیش وغم در دل نمی افتد خوشا آزادگی
بادہ وخوننابہ یکساں است در غربال ما

(غالب)

***

انور شیخ کی غزل میں عصری شعور کی گونج

دراں دیار کہ گوہر خریدن آئیں نیست
دکاں کشودہ ام و قیمت گہر گویم

(غالب)

ارباب دانش وبینش کا ہر دور میں یہ المیہ رہا ہے کہ انہوں نے ایسے ہی دیار میں جہاں گوہروں کے پارکھی نہیں ہیں یا وہاں الماس و جواہر لعل و گہر خریدنے کا دستور نہیں ہے وہیں اپنی دکان کھولی اور صرف دکان ہی نہیں کھولی ہے بلکہ ان بیش قیمت اشیاء کی قیمتیں بھی آنے جانے والوں اور راہگیروں کو بتاتے رہے ہیں۔ ہر چند کہ ان کے آبدار گوہروں کو لوگ خذف ریزوں سے بھی بدتر سمجھتے رہے ہیں پھر بھی انہوں نے اپنی روش ترک نہیں کی اور یہی کرتے رہے کیونکہ جب بچھوا اپنی جبلت نہیں بدل سکتا تو پھر اسے ڈوبنے سے بچانے والے اپنی روش کیوں بدلیں۔ ظاہر ہے کہ غالب کا یہ شعر عصری شعور کی طرف اشارہ کرتا ہے، ہر زمانہ میں اس طرح کے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ غالب کے بعد بھی تھے، ان سے پہلے بھی۔ المیہ یہی تھا اور تمام ارباب بینش کا المیہ ہے بھی یہی۔ قسمت بھی یہی ہے۔ ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں وہ دور بھی ایسے ہی لوگوں کا ہے جہاں خذف ریزوں، سنگ ریزوں اور خشت ریزوں کو گوہر سمجھا جاتا ہے اور گوہروں کو ٹھیکروں سے بھی بدتر سمجھا جاتا ہے۔ ان حالات میں ہر باشعور انسان کے لئے ایک مسلسل اضطراب ہے، ایک مسلسل کرب ہے جس سے وہ نبرد آزما رہتا ہے اور پھر وہ جوفن کار ہو اسے اس کے فن کی قیمت دینے والا کوئی نہ ہو، سب اُس کی اس روش پر خندۂ استہزا کا مظاہرہ کرتے رہیں، انور شیخ بھی انہیں ارباب بینش میں سے ایک ہیں جن کے فن پاروں پر تو کوئی نگاہ نہیں کرتا ہاں اس میں خامیاں اور کوتاہیاں تلاش کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ فن کی مستی خود میں اتنی تونگر اور توانا ہے کہ وہ انسان کو تمام چیزوں سے بے نیاز و بے گانہ کر دیتی ہے۔ انسان اپنے گرد و پیش سے تو بے نیاز نہیں

ہوتا لیکن اپنے فن پاروں کی قدر و قیمت سمجھتا ہے۔ ان کا تحفظ بخوبی کر سکتا ہے۔ عصری حسیت، اس کا گہرا شعور، اس کی درخشانی و بیباکی، انور شیخ کی غزل کا مستحکم حوالہ ہے لیکن اس سے پہلے کہ حوالے میں کچھ پیش کیا جائے اور بات شروع ہو کچھ اور باتیں بھی عرض کرنا ضروری ہے، ایک تو یہ کہ انہوں نے اپنے عہد کے تمام واقعات کو اپنے احساسات کے رنگوں میں بھگو کر پیش کیا ہے۔ اس کے لئے الفاظ کا بے محابہ استعمال بھی ہے۔ لفظ مخصوص نہیں ہے جہاں کہیں بھی ہوتا ہے اس میں سے نئے نئے رنگ ابھرتے ہیں۔ انہوں نے اسے بخوبی سمجھا ہے۔ ان کے ذہن کے افق پر ان کی مشعل افکار روشنی بکھیر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک شوخی در آئی ہے۔ جمالیات کے حوالے سے انہوں نے اپنے پورے عہد کو دیکھا ہے اور اپنے لفظوں میں پیش کیا ہے۔ اس میدان میں ان کا مطالعہ گہرا ہے، مشاہدہ بہت اہم ہے، جس نے انہیں گرد و پیش پھیلے ہوئے عہد کی تفہیم کا شعور دیا ہے۔ انہوں نے اپنے معاصرین کو پڑھا ہے، ان زبانوں کو بھی پڑھا ہے جو اب قدیم کتابوں میں زندہ ہیں۔ اپنے عہد کو قدیم میزانوں میں رکھ کر تولا ہے۔ اس سیر و سفر میں ان کی ملاقات ان سے بھی ہوئی ہے جو طلوع صبح کے بعد سب سے پہلے انسانی سروں کے اہرام دیکھنا پسند کرتے تھے۔ ان سے بھی وہ ملے ہیں جو دعائے نیم شبی یا گریۂ نیم شبی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ انہوں نے تمام زمانوں کو دیکھا ہے کہیں بصارت کارفرما ہے تو کہیں بصیرت مناظر کو سمیٹ رہی ہے لیکن بصیرت کے رنگ چونکہ جاوداں ہیں اس لئے انہیں رنگوں کا جلوہ دیکھتے بنتا ہے۔ انور شیخ نے اس شاہراہ حیات کو بھی دیکھا ہے جس کے لئے علی سردار جعفری نے یہ اشعار کہے تھے اور عزم و عمل کی تعلیم دی تھی:

یہ آدمی کی گزرگاہ شاہراہِ حیات
ہزاروں صدیوں کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
شکستہ دوش پہ دیوارِ چین کو لادے
سروں پہ مصر کے اہرام کو سجائے ہوئے
یہاں سے گزرے ہیں چنگیز و نادر و تیمور
لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں جلائے ہوئے
اٹھو اور اٹھ کے انہیں قافلوں میں مل جاؤ
جو منزلوں کو ہیں گرد سفر بنائے ہوئے

قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدین وطن
مجاہدین وطن، ہاں قدم بڑھائے ہوئے

اس شاہراہ حیات کو انور شیخ نے بہت قریب سے دیکھا ہے لیکن احمد ندیم قاسمی کی زبان میں وہ انسان سے قطعی مایوس نہیں ہیں کیونکہ انسان بہر حال عظیم ہے:

اس قدر پیار ہے انساں کی خطاؤں سے مجھے
کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا

ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کو ماننے والے عصری شعور رکھتے ہیں، ان کی نگاہ میں انسان کی عظمت و بلندی بھی ہوتی ہے اور اس کے مزاج کا سفلہ پن بھی۔ شعور ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں سارے مناظر سمٹ آتے ہیں۔ اک دیدۂ بینا ہے جس کے توسط سے منظروں کی شکل میں غیر فانی کرب روح کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ بڑے سچے اور حقیقی شاعر کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ اس کا اپنا ماضی تو ہوتا ہی ہے لیکن اس کی تحویل میں پوری انسانی نسل کا ماضی سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے جس کے حوالے سے وہ مستقبل کو دیکھتا ہے، اس کی نشاندہی کرتا ہے، اس کی بشارتیں دیتا ہے۔ ہر صدی اپنی پیش رو صدی کے نقوش اور عکسوں کی روشنی میں کام کرتی ہے اس کے واقعات و حادثات گزشتہ صدی کے ان لمحوں کے عکاس ہوتے ہیں جو بادی النظر میں ماضی کے نہاں خانوں میں قیام پذیر ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی حمام باد گرد کے اس الماس کی طرح جگمگا رہے ہیں جس کی تلاش میں حاتم ہر جِ مرج کھینچتا ہوا وہاں پہونچا تھا اور یہ لمحہ الماس پیکر ہی ایک حساس اور دردمند فنکار کو نئے جہانوں سے روشناس کراتا ہے۔ اس کے سامنے معاشرتی ناہمواریاں ہوتی ہیں۔ سماجی بے انصافیاں ہوتی ہیں۔ ذہنی انتشار اور شکست و ریخت کا ایک ہولناک منظر ہوتا ہے جو اس کے دردمند دل کو آنسوؤں سے بھر دیتا ہے۔ یہ زخم ہمیشہ ہرا رہتا ہے۔ وقت اس کا مرہم تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا فنکار اپنے عصری کرب کو اپنے اشعار میں یا اس کے پاس جو بھی پیرایۂ اظہار ہوتا ہے اس میں ڈھالتا ہے۔ انور شیخ کے یہاں غزل ایک پُر اسرار اظہار سے عبارت ہے جس میں انہوں نے جمالیات کے الماس کو کوٹ کوٹ کر بھرا ہے پھر اس سے خوشنما اور دلچسپ پیکر بنائے ہیں، خدوخال تراشے ہیں جن کی رگ رگ میں انسانی نسل کا کرب ایک آتش سیال و مضطرب کی طرح رواں ہے۔ یہ اشعار دیکھئے:

عنایت اور کیا ہوگی رفیقو کہ ہر لمحہ زماں ہونے لگا ہے

گلہ اس غیر کا، اپنے ہی آنسو
چراغ دل بجھانے آگئے ہیں

سبھی شاکی شکایت بن گئی اصل زباں یارو
کوئی یزداں ہو یا شیطاں کروں کس سے شکایت میں

ذرہ ذرہ منفی و مثبت کے چکر میں پھنسا
رازِ ہستی جس میں ہے پنہاں سرور کشمکش

مثل ریشم زندگانی سخت بھی ہے نرم بھی
بن سکے یہ گلستاں ہے زندگی نوک سناں

یہ زندگی اک معرکہ پھولوں کا گلدستہ نہیں
شہباز کا ہے گھونسلہ پھولوں کا گلدستہ نہیں

بجنے کو بے قرار اگرچہ تھا ہر گھڑی
نغمے نہیں بنا سکا ساز حیات کو

یہ کیسی فطرت انساں کبھی یزداں کبھی شیطاں
کبھی بندہ کبھی خاقاں نہ گھبرا اے دل ناداں

جو دشمن ہے نہ فکر اپنی یہ اپنوں کا گلا کاٹیں
کریں کیا تم کو تلوارو کوئی آ ہم کو سمجھائے

ہمیں دنیا نے روندا اور لٹکایا مگر پھر بھی
نہ سیکھا طور فرزانہ تعجب ہے تعجب ہے

یہ ممکن کہ ہو رہزنوں کا وہ رہزن
کہ جو تیرا رہبر سنبھل جا سنبل جا

کرتی ہے کہ وہ تخلیق وتفکیر ایجاد واختراع پر کس درجہ عبور رکھتے ہیں چنانچہ میں ان نو ایجاد اصناف سخن کا یکے بعد دیگرے جائزہ لیتا ہوں لیکن یہ کہنا بھی ضروری ہے انور شیخ کے گلخن فکر سے ڈھل کر جو بھی فن پارہ نکلتا ہے خاص طور پر شعری پیکروں میں تجسیم کیا ہوا اس میں وہ تمام تلازمات وانسلاکات صنائع بدائع پائے جاتے ہیں جو شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں خواہ فن پارہ ان کی ایجاد کردہ اصناف سے تعلق رکھتا ہو یا پھر کچھ اور ہو، دوسری بات یہ ہے کہ ان ایجاد کردہ شعری اصناف کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں غزل سے جا کر مل جاتے ہیں اس لئے مجھے یہ کہنے میں کچھ باک نہیں کہ انور شیخ کے مزاج داں، نبض شناس اور راز دار ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے شعری پیکر ہوں یا نثری فن پارے، ایک طرح کی ہزار شیوگی در آئی ہے، کچھ لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ ناظورۂ شاعری کی زلفوں کے اسیر بعد میں ہوئے اولاً وہ نثر نگار تھے لیکن جب میں نے ان کے کاموں کا بالا ستیعاب مطالعہ کیا تو میں نے پایا کہ ان کے مزاج میں کہیں ایک شاعر چھپا بیٹھا تھا جسے انہوں نے باہر لانے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن غیر ارادی طور پر وہ ان کے نثر پاروں میں اظہار ونمود کا جلوہ دکھاتا رہا ہے لیکن جب انہوں نے باقاعدہ اسے کھل کھیلنے کا موقع دیا تو وہ غزال رعنا اس شوخی کے ساتھ آمادۂ رم ہوا کہ تمام بے کراں کائنات اس کے نقش پا میں سمٹی ہوئی نظر آئی اور خود انور شیخ کے بطون کی گہرائیوں سے یہ صدا بلند ہوئی کہ،، ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی،، بہر حال یہ تو تمہیدی سطور تھیں، میں بات شروع کرتا ہوں تکونی سے جو ۱۹۹۸ء میں معرض اظہار میں آئی۔ اس باب میں انور شیخ نے اس شعری صنف کا تعارف کراتے ہوئے ہندوستان کی قدیم تہذیب کا جائزہ لیا ہے۔ ہندوستانی ویونانی دیومالا کے حوالوں سے گزرتے ہوئے انہوں نے ہندوستان وپاکستان کی موجودہ صورتِ حال پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ انہوں نے تکونی جیسی صنف سخن پیش کرنے کی ضرورت محسوس کیوں کی، فرماتے ہیں:

> ''تکونی اپنی ڈرامائی نوعیت کے سبب ہندی النسل یعنی بھارتی بھی ہے اور پاکستانی بھی علاوہ ازیں اس کا دائرہ بیان اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ہر ایک موضوع پر خیال آرائی کی جاسکتی ہے اگر چہ اس میں طنز ومزاح کی بھی گنجائش ہے، تکونی کی اساس منطق اور سنجیدگی پر ہے۔ میں ترویٰ وترائلے

باتیں نہ کرو امن کی بس اتنا بتاؤ
وہ نوحۂ جاں کوئی نہیں ساز نہیں ہے

کہو اے لیڈرو کیسا یہ فن الو بنانے کا
حقیقت میں تو ہو شیطاں کرو ایمان کی باتیں

ان اشعار میں تجربات کی پختگی بھی ہے، مشاہدے کا عارفانہ عروج بھی۔ گریبانِ شفق میں فکر ضوفشاں کی زرخیز سحر موجود ہے جو شاعر کے سارے وجود کو ہی نہیں تمام بساط آب وگل کو سیراب و شاداب کر رہی ہے جہاں لوح تمنا پر جو حرف جگمگا رہے ہیں ان میں مستقبل کی بشارتیں، بصیرتوں کے وہ چراغ بھی ہیں جن کی روشنی غیر فانی ہے۔ شاعر دیکھ رہا ہے کہ چاروں طرف کارگاہ حیات میں رزم بلاخیز جاری ہے، شمشیریں لپک رہی ہیں، خون چھڑک رہی ہیں، انسان اپنی ایجاد و اختراع کے حوالوں سے روشنیوں سے تمام بساط عالم پر تابناک آفتابوں کی مرصع کاری کر رہا ہے۔ بس یہ کہ انور شیخ کی زبان بیباک ہے۔ ان کے لہجے میں ایسی شیرینی ہے جس میں ہلکی سی تلخی بھی ہے اور یہی اس شیرینی کا لطف ہے۔ بیک وقت دو ذائقے رکھنے والے زندگی کے تجربات خود میں عظیم الشان مملکت کی طرح ہیں جہاں ہزاروں لمبے چراغوں کی طرح روشن ہیں اور دور و یہ اشجار جن کی شاخوں میں گزراں ماہ و سال کے مہر و مہتاب درخشاں نظر آتے ہیں۔ انور شیخ کی غزل مجھے اس انداز سے نمایاں نظر آتی ہے کہ وہ کھل کر بے کم و کاست اظہار خیال کرتے ہیں، مصلحت کی رنگ آمیزی نہیں کرتے اور کنجشک فرومایہ کی رگوں میں وہ توانائی، وہ پسی ہوئی بجلیاں بھرنے کی کوشش کرتے ہیں جو شاہین کے مقابل آجاتی ہے۔ ان کے یہاں اس طرح کے علائم اور استعارے نہیں ہیں جیسے کہ اقبال کے یہاں ہیں لیکن زندگی کا ایک ایسا حوصلہ موجود ہے جس کی اس عہد کو ضرورت ہے۔ ایک عزم ہے، ایک بلند و بالا روشنی کا مینار، ایک شاہراہ ہے غیر مختتم لامتناہی اور ان سنگ میلوں سے آراستہ جس پر وہ موجودہ نسل کو چلنے کی تلقین کرتے ہیں اور نا آفریدہ نسلوں کے لئے بھی بہت کچھ سرمایہ جمع کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ یا فلسفہ خالص انسانی ہے اسی لئے انہوں نے کہا ہے:

فکر مت کر لوگ جو کہتے ہیں انور شیخ تو
اپنی خود تشہیر ہے تقدیر کا شکوہ نہ کر

لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ یزداں کی عظمتوں، اپنے خالق کی طاقتوں، اس کے محیط عالم ہونے سے منحرف ہوں یا اس کا شکریہ ادا نہ کریں:

کمال آدمی کی کوئی حد ہی نہیں انور
یہ راز قوت یزداں نہ گھبرا اے دل ناداں

اس طرح کے اشعار ان کے یہاں کثرت سے ہیں جن سے عزائم کی شراب ناب تقطیر کر رہی ہے۔ جسے پی کر انسان غیر فانی منزلوں تک جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں عصری شعور اور ابنائے روزگار کو جس انداز سے دیکھا ہے اسکی مثال ان کی شاعری میں کثرت سے ہے لیکن اس ضمن میں میں اپنے دعوے کیلئے ایک دلیل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی اس تحریر سے پیش کروں گا:

''ادب کے بارے میں اس بات کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ تخلیق محدود نہیں ہے، تخلیق کو محدود کرنے یا اس کی راہ پر ڈالنے کی کوشش نہ صرف فعل عبث ہے بلکہ تخلیق کے ہی مزاج کے خلاف ہے۔ ادب بہتا پانی ہے یہ کناروں کو توڑنے، موجوں سے ٹکرانے، نئے کھیتوں کو سیراب کرنے کا عمل ہے یہ عمل محدود کی ضد ہے۔ ادب ان دیکھی کو دیکھنے، ان کہی کو کہنے، ان سنی کو سننے، ان چھوئی کو چھونے کا عمل ہے۔ ایسی ان کہی کو کہنے کا جس کی خود ادب کو خبر نہیں، شاید کبھی ہوگی بھی نہیں۔ ادب میں خبر اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ بے خبری، شعور اتنا ہی اہم ہے جتنا لاشعوری، بیان اتنا ہی اہم ہے جتنا تحت بیانی۔ تخلیق کی کا فرادائی بہت کچھ وہی ہے جو حسن والوں کا شیوہ ہے یعنی بقول غالب ''سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری،، جو دونوں باہم دگر ایک دوسرے کی تنقیض ہیں۔ گویا ادب مانوس کو منسوخ کرنے اور منسوخ کو مانوس بنانے کا عمل ہے دوسرے لفظوں میں ادب میں گویائی ہی سب کچھ نہیں خاموشی بھی بہت کچھ ہے جہاں معلوم کے پر جلتے ہیں۔ تخلیق کے حضور میں ہر عمل چھوٹا مقید مجبور اور محدود رہ جاتا ہے۔ ادب کی ہر کہانی لامحدود کے تقاول کی نئی داستان کہتی ہے جہاں تجربہ متحیر اور زبان گنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ادب کا کام متعینہ اقدار کی

پاسداری نہیں ۔ ہرفن پارہ کسی نئی سچائی کا اثبات ہے اس طرح ادب ایسی بصارت اور ایسی بصیرت ہے جو متعینہ علوم سے آگے جاتی ہے۔ ادب میں آئیڈیالوجی بھی وہی سچی اور کھری ہے جو متعینہ اور متوقع کو نہ دہرائے بلکہ غیر متوقع انجانے ان دیکھے کو دکھا سکے ادب بے نام کو نام بے آواز کو آواز دینے کا عمل ہے یا ایسے سُر کو سننے اور گانے کا جو سنگیت کے راز کا محرم تو ہو لیکن پہلے کبھی سنایا گایا نہ گیا ہو۔''

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس میں ادب کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہم اپنے تجربہ کو کس طرح ادبی پیکر دے سکتے ہیں خواہ وہ ڈھانچہ کوئی بھی ہو ظاہر ہے کہ انور شیخ صرف غزل گو نہیں ہیں وہ افسانہ نگار بھی ہیں اس کے علاوہ انہوں نے کئی اصناف سخن ایجاد کی ہیں جن کے وہ ماہر ہیں ۔ ارباب ادب نے ان کی تقلید بھی کی ہے اس کے علاوہ وہ اعلیٰ تنقیدی نثر بھی لکھ سکتے ہیں ۔ فلسفۂ مذاہب پر ان کا گہرا مطالعہ ہے چنانچہ اس ہمہ جہت شخصیت کو اپنے تجربات کو عظیم تر بنانے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ اسے بڑا پیکر عطا کر سکتے ہیں اور انہوں نے ایسا کیا بھی ہے لیکن یہاں میرا موضوع ان کی غزل ہے اس لئے میں اس کے حوالے سے بات کرتا ہوں ورنہ ان کے یہاں بہت کچھ ہے ۔ سب کچھ ایک مرکز پر طلسم کی طرح ہے ۔ صدیاں جا چکی ہیں اسی طرح ابدالآباد تک کتنی ہی صدیوں کا سفر جاری رہے گا طلسم کشا پیدا ہونگے طلسم فتوحات سے ہمکنار ہونگے ۔ اس ضمن میں میں اپنا ایک شعر پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں:

متاعِ حرف و ہنر سے میں ناامید نہیں مرا قلم مری نا آفریدہ آل کے نام

اس کائنات میں صرف تغیر کو ہی ثبات ہے ۔ ظاہر ہے کہ تغیر ایسی چیزوں کو جنم دیتا ہے جو تمام عقدوں کے سرکشا ہونے کا سبب بنتی ہیں اس لئے انور شیخ کے منظر نامے کو ان کے اس اثر سے الگ کر کے کیسے دیکھا جا سکتا ہے ۔ اسی سے اندازہ ہوگا کہ متاع حرف و ہنر کیا چیز ہے ۔ جہاں چاروں طرف ایک حصار ہوتا ہے ۔ اس حصار کو صرف اولاد آدم ہی توڑتی ہے لیکن رشتوں کا انقطاع بھی وہیں سے شروع ہوتا ہے ۔ گویا تخریب ہو یا تعمیر سب کچھ اسی میدان اور اسی افق سے نمودار ہوتا ہے ۔

ہمارا عہد اپنے کرب میں ایک عجیب منظر نامہ ہے ۔ میں سوچ نہیں سکتا ہوں کہ

بیسویں صدی اپنے آخری لمحات میں اس قدر تیز رفتار بھی ہوگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام اقدار انسانی بدل گئیں۔ میں سوچتا ہوں کہ جب بیسویں صدی شروع ہوئی تھی اس کی رفتار بے حد سست تھی لیکن اپنا نصف اول پار کرتے ہی اس کا سفر تیز ہو گیا ایسا لگا کہ رخش زمانہ بے حد رفتار سے اڑا چلا جا رہا ہے'' نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں'' حالانکہ تمدن کی جو آگ ایک چنگاری بن کر جو صدیوں سے سلگ رہی تھی وہ کسی وقت بھی شعلہ بن سکتی تھی لیکن اسے شعلہ بیسویں صدی میں بننا تھا سو بن گئی حالانکہ اکیسویں صدی طلوع ہو چکی ہے اس کی حیثیت ابھی ایک طفل شیر خوار جیسی ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس طفل کی آنکھوں میں کیسی پراسرار چمک ہے جو آنے والے دنوں میں عظیم واقعات کو جنم دے سکتی ہے۔ بیسویں صدی کے فنکاروں کے یہاں اس طرح کا احساس بہت شدت سے ابھرا تھا اور اس طرح کے فن پارے وجود میں آ گئے تھے جن میں ہزاروں رنگ ہیں:

الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بہت بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

(مخدوم)

چھپا تھا ہیرا کوئی راستے کے پتھر میں
ہماری ٹھوکروں نے اس کا انکشاف کیا

(غلام مرتضیٰ راہی)

پھول تھے خزاؤں کے، رنگ تھے ہواؤں کے، برگ و بار پاؤں کے
کچھ نہیں تھا باغ میں، ہاں اک انتشار تھا اضطراب آشنا

(یاور وارثی)

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا

(وزیر آغا)

زرد پتے کہ آگاہ تقدیر تھے ایک زائل تعلق کی تصویر تھے
شاخ سے ان کو ہونا تھا آخر جدا ایسی اندھی ہوا کی ضرورت نہ تھی

(بانی)

شور کرنا ہمیں بے وجہ نہیں آ گیا ہے
ایک خنجر رگ گردن کے قریں آ گیا ہے

(عرفان صدیقی)

دامان شب میں دن کے اجالے کی بھیک ہے
تاروں میں بٹ گئی ہے کرن آفتاب کی

(احمد ندیم قاسمی)

وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں چراغِ رخ ہے نہ شمع وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

(فیض احمد فیض)

اصل نوید یہ ہے کہ اپنے لمحۂ پیدائش سے لیکر لمحہ اختتام تک بیسویں صدی بے حد اضطراب کی صدی تھی۔ طرح طرح کے اذہان کا جنم ہوا۔ طرح طرح کی ادبی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ طرح طرح کے سیاسی انقلاب آئے۔ میں نے شروع میں یہ عرض کیا تھا کہ ہر صدی اپنی رفتہ صدی کے نقوش سے ثمر آور ہوئی ہے اس لئے ہم جس صدی میں قدم رکھ چکے ہیں اسے معمولی نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ الگ بات ہے:

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ نغمہ و صوتِ ہزار کا موسم

(فیض)

لیکن جو دیکھیں گے ان میں جو اہل دانش و بینش ہونگے وہ بیسویں صدی کو اپنی نگاہ میں تاریخی اعتبار سے ضرور رکھیں گے۔ ہر چند کہ وہ اس تجربے سے گزرے نہیں ہونگے کہ اس میں کہاں کہاں انقلاب آئے۔ ملکوں کی تقسیم، تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت، ہجرت کا عذاب، طبقاتی کشمکش، سیاسی قمار خانوں میں شاطران وقت کی کارفرمائی، کیا کچھ اس صدی کے دامن میں نہیں تھا اور کیا کچھ یہ صدی اس صدی سے احتساب کر رہی ہے۔ نئے ماہ و سال کے تناظر میں تجربہ اور احتساب ہوگا اور اس چراغ کی لَو مزید سرخ ہوگی۔ ہم اس کی آہٹیں سن رہے ہیں اور اپنے نقوش فن اسی روشنی میں ترتیب دے رہے ہیں۔ انور شیخ کے یہاں یہ جلوہ دیکھئے:

ہم جس کے منتظر تھے وہ آیا کبھی نہ کل گنتے رہے حیات کا ہم ایک ایک پل

اگر چاہت ہو پھولوں کی الجھنا سیکھ کانٹوں سے
سنے گر تجھ کو بتلاؤں جو فرق خار و گل ہم دم

انسانی نسل کی آنکھوں میں ہمیشہ ہی کل کے خواب ہوتے ہیں کہ آنے والا کل کتنا روشن ہوگا، کتنا ارتقا پذیر ہوگا، سکون خیز ہوگا۔ آنے والے کل کی ابتدا اپنے آپ میں ایک لذت انگیز چیز ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس سے انسانی زندگی کے بہت سے عوامل وابستہ ہوتے ہیں لیکن صبح فردا آئی ہے کس انداز سے۔ کیا وہ انتشار آمیز ہے، کیا وہ سکون کے تمام لمحوں کو مقتل زیست میں قربان کر کے آئی ہے۔ یہ ایک پیچیدہ فلسفہ جو برسوں سے نہیں بلکہ صدیوں سے جاری ہے۔ وجہ اس کی صاف ہے کہ جہاں استحصالی نظام ہے اسے تاریک دور سے تشبیہ دی جاتی ہے پھر اس کی ایک رنگین صبح ہوتی ہے۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ ہندوستان آزاد ہوا تو ایک شاعر نے پوچھا تھا:

ہند صدیوں کی غلامی سے تو آزاد ہوا
تم بھی آزاد ہوئے اہل وطن سے پوچھو

(جاں نثار اختر)

مگر آزادی کہاں ملی؟ جس طرح کوئی چیز اپنے مدار سے آزاد ہونا چاہتی ہے، وہ اپنے مرکز سے جست بھی کرتی ہے مگر جس مدار میں جاتی ہے وہ اس کے لئے زنداں بن جاتا ہے۔ اس لئے گویا ایک زنداں سے نکل کر دوسرے زنداں میں اسیر ہو جانا لیکن استعماری نظام کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی نگاہوں میں خواب تھے وہ خواب آج بھی ہیں کیونکہ جس سحر کا انتظار تھا وہ آئی کہاں۔ سحر شب گزیدہ تھی، اجالا داغ داغ تھا یعنی نجات دیدہ و دل کا لمحہ طلوع نہیں ہوا۔ انور شیخ نے اپنے اس شعر میں یہی خیال پیش کیا ہے کہ ہم جس منظر کے منتظر تھے وہ آیا ہی نہیں، جس لمحۂ طلوع کے لئے آنکھیں کھلی رہیں وہ طلوع ہی نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ آنکھیں پتھرا گئیں۔ دوسرے شعر میں فرق گل و خار کی نشاندہی یوں پیش کی گئی ہے کہ کانٹے لہولہان کر رہے ہیں اس لئے گل تک پہونچنے کیلئے انگلیوں کا لہولہان ہونا ضروری ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی پھول تک پہنچنا چاہے اور انگلیاں فگار نہ ہوں، خونچکاں نہ ہوں۔ اس لئے اس شعر کی تفہیم و تشریح میں سب سے اہم پہلو یہی ہے کہ گل مراد تک رسائی اسی وقت ہو سکے گی کہ انگلیوں سے خون کی تقطیر ہو رہی ہو یعنی اگر پھول کے پیرہن سرخ کا لمس درکار ہے تو پہلے ہاتھوں کو سرخ کرو ممکن ہے تمہاری انگلیوں کو اپنا ہی ہم جنس سمجھ کر اپنی آغوش وا کر دے اور

تمہیں سرشاریوں اور سرمستیوں کے جزیرے میں بہالے جائے یہ دور قحط الرجال ہے انور شیخ کو اس بات کا احساس ہے۔ ان کے یہاں اشعار میں جو ہمہ جہتی ہے تنوع ہے اس میں مضامین کا ایک طویل سلسلہ ہے اور اس انداز سے ان کی فکر کا تنوع آمیز منظر پیش کرتا ہوں:

ہوا کچھ عجز سے کچھ بھی کہہ سکتی ہے بے دینی
نہیں شبنم ہے تو اخگر مجھے کہتا ہے دل میرا

اس شعر میں شائستگی دیدۂ تر کی تہذیب نہیں ہے بلکہ مزاج کی سختی اور صلابت کو بروئے کار لانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس مکار و عیار دنیا میں کتنی ہی مناسب و نامناسب اشیاء ہیں تم شبنم کی بوند نہیں ہو چنگاری ہو اس لئے ضروری ہے کہ ہر ایک کے خرمن کو تر و تازہ نہ بناؤ بلکہ چنگاری کو شعلہ جوالہ بننے کا موقع دو تا کہ خرمن خاکستر میں تبدیل ہو سکے۔ آج کے عصری نظام پر یہ شعر بے حد باوزن با توقیر اور پر تاثیر ہے۔ مختلف رنگوں کے اشعار کچھ اس طرح ہیں:

اک خار زار دنیا کس کو قرار حاصل
پوچھو نہ بے قرارو کیا تم کو ہو گیا ہے

تم کو بتاؤں میں کیا دنیا قمار خانہ
مشکل ہے راز جانے اپنا قمار خانہ

کوئی ٹھکرا نہ پائے اس صدف کو
کہ جس میں کوئی پوشیدہ گہر ہو

شروع کے دو شعروں میں دنیا کی حقیقت واضح کی گئی ہے پہلے شعر میں واضح طور پر یہ منظر ابھرتا ہے کہ خار زاروں میں کس کو قرار مل سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کانٹوں میں الجھ کر لہولہان ہونے کی کیفیت ابھرتی ہے پھر مسلسل تلملاہٹ زخموں سے خون رسنے کی حالت نظر آتی ہے اور اسے قرار کہاں حاصل ہے اور پھر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ بے قراری کیا ہے یعنی پہلے تو خار زاروں میں جا کر بھٹکتا ہوں پھر جب درد سے تلملانے لگا تو پوچھا آخر اضطراب کیا ہے مستی ہے، بیقراری ہے، کیسا عجیب سوال ہے سب کچھ جان کر بھی تجاہل کیوں؟ دوسرے شعر میں دنیا کو قمار خانہ کہا گیا ہے یعنی ہر شخص یہاں جوا کھیلنے میں مصروف ہے، شرطیں لگا رہا ہے، بازی لگا رہا ہے، قرعے

ڈال رہا ہے، لاٹری کا استعمال کر رہا ہے، ہر شخص دوسرے کے برابر جانے کے شوق میں مبتلا ہے لیکن ایسا ممکن نہیں۔ ہر شخص جواری ہے۔ کون ہے جو اس کا عادی نہیں ہے۔ پر لطف بات یہ ہے کہ دنیا ٹھیک اس مملکت کی طرح ہے جس میں حاکم بھی جواری محکوم بھی جواری۔ سیاسی قمار خانوں میں لوگ بیٹھے ہیں، چالیں چلی جا رہی ہیں، ایک بساط پر شطرنج جمی ہوئی ہے، ہر قمار باز چال چل رہا ہے۔ شاعروں نے ان سیاسی قمار خانوں کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا اور کہا تھا:

دیکھ وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کرنے لگیں
اور سیاسی قمارخانوں میں
کہنہ شاطر بہم الجھنے لگے
فرصت یک نفس غنیمت جان
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق

(ساحر لدھیانوی)

لیکن دبی ہوئی مخلوق نے اپنا سر نہیں اٹھایا اور اس کی گردن میں غلامی کا جوا مزید کستا چلا گیا۔ یہ کھیل جاری ہے، چالیں چلی جا رہی ہیں، بساط عالم پر مہرے پٹ رہے ہیں، شکست خوردگی سے دوچار ہیں، انسانی نسل درد سے کراہ رہی ہے مگر قمار بازوں کو فرصت کہاں کہ وہ اپنی بازی چھوڑ کر اس طرف دیکھیں لیکن آخری شعر میں انور شیخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان جہاں بھی ہے عظیم ہے بشرطیکہ انسان ہو قمار بازی کا عادی نہ ہو، ساری دنیا کو لڑانے کا کام نہ کرے بلکہ ایسا صدف ہو جو دنیا کو روشن کرے، گہر ظاہر ہے کہ ایک انسان کا استعارہ ہے زمین و آسمان صدف کے کھلے ہوئے دروازے ہیں لیکن انسان کو چاہئے کہ وہ گہر بن کر جب صدف سے باہر آئے تو وہ کردار پیش کرے جس سے اس کی پرستش ہو کیونکہ لاکھ قحط الرجال ہو لیکن ایسے انسان کی ضرورت تو باقی رہے گی۔ یہی وہ نجات دہندہ ہوگا کیونکہ جس سمندر میں یہ گوہر ہے وہ گوہر ابر نیساں کی طرف نظر رکھتا ہے۔

ہر شخص کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ کچھ شاعر عصری کرب و درد کا احساس نہیں رکھتے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ اگر ہم دردمند دل رکھتے ہیں اور انسان ہونے کا دعویٰ ہے، احساس کی بالیدگی ہے ظاہر ہے کہ ہمارے سینے میں پارۂ سنگ تو نہیں دل ہے جو دھڑک رہا ہے۔ سب کچھ دیکھتے

ہوئے بھی بہت کچھ فراموش ہو جاتا ہے۔ بہت کچھ نقوش کی شکل میں آجاتا ہے۔ زندگی ہم سے جو تقاضے رکھتی ہے ہمیں انہیں پورا کرنا ہے۔ ہم ان سے انحراف نہیں کر سکتے کیونکہ ہم ہی نقطۂ پرکار ہیں۔ جس کے دم سے دائرے بن رہے ہیں۔ عصری نظام کے حوالے سے بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایجاد میں بین الاقوامی سطح پر ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھا جاتا ہے یعنی جس صورت کو سیکولرزم کا نام دیا گیا ہے۔ شاعروں نے اس میدان میں اپنے پرچم خوب لہرائے ہیں انور شیخ نے بھی کہا ہے:

مجھ پر کھلا یہ راز آخر دیس کی عظمت ہے کیا
جو آبرو ہے فرد کی جو اصل میں شان وطن

شاعر اپنے وطن سے شاکی نہیں ہے۔ اس مٹی کی خوشبو کی بات کرتا ہے جس نے اسے جنم دیا ہے، گود کھلایا ہے، پیار کیا ہے، انسان اس سے کبھی بھی کسی بھی حال میں دامن چھڑا نہیں سکتا۔ انور شیخ کی غزل کا بیشتر حصہ پنجاب کی سرزمین سے وابستہ ہے۔ اس سرزمین نے انہیں جنم دیا اس پیکر خاکی کا کمال بھی ہے اور یہی اس مٹی کا کمال بھی ہے جو وطن کی رہگزاروں میں قیام کرتی ہے۔ اس کرۂ ارض پر انسان صدیوں سے رہ رہا ہے یہ تمام کرہ ارض اس کے مزاج سے واقف ہے خاک کا ذرہ ذرہ انسان کا مزاج شناس ہے اور انسان خود مٹی کا مزاج شناس ہے کیونکہ تمام مستی و سرشاری اسی کی دین ہے کیونکہ وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتا اس کا رشتہ گوشت اور ناخن جیسا ہوتا ہے انسان کہیں چلا جائے دنیا کے کسی حصے میں قیام کرے مگر ایک آرزو اس کے سینے میں مچلتی رہتی ہے۔ یہ نہایت کمتر بات ہے کہ

شکم کی آگ لئے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا

(افتخار عارف)

بعض سیاسی قمار بازوں کے نزدیک یہ شعرا ہم ہو سکتا ہے کہ مجبور ہو کر ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ صدیوں سے انسان کا یہی المیہ ہے لیکن بعض خطہ زمین اس کے لئے قفس بن جاتا ہے وہ دیکھتا رہتا ہے مگر کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن آرزو کی جنگ سے بے نیاز وہی ہے جیسے کہ انور شیخ انہوں نے ایک ایسے خطے میں جنم لیا جو عشق کی سرزمین ہے، حسن کا سیل بیکراں ہے جہاں ادب، ثقافت، موسیقی، رنگ روپ، اخلاقی سربلندی اس زمین کا سرمایہ ہے اور اس کی روحانیت ہے۔ دیار

مغرب میں جا کر بس جانے کے بعد بھی وہ اسے فراموش نہیں کر سکیں ہیں حالانکہ ان کے اندر عصری شعور ہے بے حد تابناک، وہ ساری دنیا کو دیکھ رہے ہیں، شاعری کے توسط سے اسے ذریعہ بنا کر مختلف تصویریں بنا رہے ہیں جن میں الفاظ کے ذخائر ہیں جنہیں نکال کر آبدار گوہروں کی طرح سجا رہے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ اتحاد ایثار کا بین الاقوامی نظریہ رکھتے ہیں۔ وفاداری میں بھی وہ شیخ و برہمن کی آزمائش چاہتے ہیں اس کلیے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کی بساط فکر کچھ بھی ہو لیکن اس سے روشنی پھوٹتی رہتی ہے۔ انہوں نے وہ لمحہ دیکھا ہے جب تن بجولاں ہو کر جانا پڑتا ہے لیکن وہ تمام زنجیروں کو کاٹ دینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ ہمت کا ایک جذبہ بھی ہے۔ امتیاز این وآں نہیں بلکہ ان کا ایک ہی نظریہ ہے جو مساوی ہے لوگ ان کے اس رنگ کے قائل ہیں لیکن وطن سے ان کی نسبت سب سے بالاتر ہے۔ ان کی تنقید وطن کی مٹی پر نہیں ہے بلکہ وہ ان رسم ورواج کی زنجیروں کو پگھلا دینا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے فن کے ذریعہ وطن کی مٹی کو عظیم تر بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ مصائب وآلام انسانی کی کسی ایک منزل پر متمکن رہنے کے قائل نہیں ہیں اور اس جذبہ کے تحت اس طرح کے اشعار ان کے قلم سے نکلتے ہیں:

بے گھری میں بھی مزہ ہے قلب زندہ کے لئے
جو کسی کے واسطے اپنا لٹا دیتا ہے گھر

ہمیں ہے پیار خوشبو سے پجاری ہم ہیں رنگوں کے
نہ ذہن گل، گلستاں ہے ارے ہم ہیں وہ دل والے

انور شیخ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دنیا کی مختلف قوموں کے ساتھ گزارا ہے۔ ان قوموں کے دماغوں کو پڑھا ہے۔ ان کی دشمنیوں کو پرکھا ہے کبھی اپنے مشاہدے سے اور مطالعے سے دونوں میدانوں میں ایک عظیم شہ سوار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں عصری شعور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ ان کے یہاں امید ہے یاس و ناامیدی نہیں۔ ان کے یہاں اس صدف کے گوہر کی آبداری کا تموج دل ونگاہ میں ہے جو ابھی اتھاہ گہرائیوں میں ہے لیکن جب طلوع ہوگا آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔

***

MODERN PUBLISHING HOUSE
9, Gola Market, Darya Ganj, New Delhi-110002
Phone: 011-23278869

EHTISAAB
(Critical and comparative study of Anwar Sheikh's Ghazal)
by : **Ishrat Zafar**

Rs. 200/-
August 2004

کے تصورات سے آگاہ ہوں، دونوں ہی قابل قدر ہیں لیکن صنف سخن ہونے کے اعتبار سے تکونی ان دونوں سے مختلف ہے یہ ایسا اندازِ بیان ہے جو عدالتی ڈرامے سے مشابہ ہے جس میں مدعی مدعالیہ اور منصف اپنا کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ یہ تینوں رول شاعر ہی نبھاتا ہے لہذا یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شاعرانہ نظام کو برقرار رکھتے ہوئے ایک پیشہ ور جج نظر نہ آئے۔ اس لئے اسے تکونی میں مبصر کا نام دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی عدالت میں مخالفین جیسی شہادت پیش کرنا چاہیں اس کے مستحق ہیں خواہ وہ عاقلانہ ہوں یا احمقانہ لیکن اس کے باوجود اسے ایک ڈھونگ Farce کا رنگ نہیں دیا جاسکتا کیونکہ تکونی کا بنیادی مقصد سنجیدہ مسائل پر پُر مغز بحث کرنا ہے اور شاعر آخری بند میں اپنی متانت اور منطقی قوت سے یہ فریضہ ادا کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تکونی شاعر ہی کی اپنی قوت اور گہرائی نظر کی کسوٹی ہے وہ اس صنف میں محض عروض و قافیہ اور لفاظی کے زور سے اپنی شاعری کا جادو نہیں جگا سکتا۔

تکونی میں کسی بحر کی قید نہیں ہے اس کے برعکس موضوع کی مناسبت سے بحر کا انتخاب ایک کار احسن ہے تکونی تین بندوں پر مشتمل ہے جس کا ہر بند چار اشعار تک محدود ہے اس بندش کا سبب یہ ہے کہ نہ صرف مدعی اور مدعالیہ کو اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کا یکساں موقع دیا جائے بلکہ مبصر بھی اس حد میں رہ کر اپنی رائے کا اظہار کرے تاکہ تکونی لفاظی کا شکار ہونے کے بجائے اپنی جامعیت اور نکتہ سنجی قائم رکھ سکے۔

مکالمہ ڈرامہ کی جان ہے جو برصغیر ہند کی ثقافتی روایات کا علمبردار ہے اور تکونی انہیں اقدار کی ڈرامائی پیشکش ہے۔ ڈرامہ کو اکثر مبالغہ اور غوغا آرائی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ ہر اس حقیقت یا افسانے کو جذباتی رنگ میں بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے جو اس کا موضوع ہو دراصل اس کا مقصد ہی ناظر یا قاری کے جذبات کو بھڑکا کر اپنے تاثر کو افزوں کرنا ہے،

انور شیخ کی غزل میں طنز و مزاح

مے بہ زہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب
پیش ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نہ رسد

(غالب)

اگر یہ کہا جاتا ہے کہ غزل ہزار شیوہ صنف سخن ہے تو پھر اس میں کوئی کلام یوں نہیں ہوسکتا کہ اس میں اسالیب کا تنوع بھی ہے، مفاہیم کی رنگارنگی بھی، حسن و عشق کی سرمستیاں، نشاط و غم کی لذتیں، خوشی اور کرب تمام موسموں کی جولانیاں کلفتیں وحلاوتیں بھی ہیں۔ علاوہ ازیں طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی پورے شعری التزام کے ساتھ باندھے جاتے ہیں، باندھے گئے ہیں لیکن اس طرح کے مضامین باندھنے والے شاعر وہی ہیں جن کے مزاج میں نکتہ سنجی بھی ہے اور بذلہ سنجی بھی مگر سب میں غزل کا وقار، اس کا شکوہ، اس کا تشخص، اس کی شان برقرار رکھی گئی ہے۔ اساتذہ سے لیکر تلامذہ تک متقدمین سے لیکر متاخرین تک اس صنف ہزار شیوہ کے مزاج کو پرکھنے والے، پہچاننے والے، اس میں امکانات تلاش کرنے والے، اس کی وسعتوں میں سفر کرنے والے، اس کے محیط اعظم کو کھنگالنے والے پیدا ہوتے رہے ہیں اور اس بساط کو منور و درخشاں کرتے رہے ہیں۔ الفاظ کا دروبست ان کا تنوع، ان کے مخفی اسرار کا انکشاف سبھی کچھ رونما ہوا۔ چنانچہ انور شیخ کے یہاں اس طرح کے امکانات غزل میں در آئے ہیں جن میں مراسم زمانہ، روایت، اقدار پارینہ وجدید کے حوالوں سے بات کی گئی ہے۔ الفاظ کا بے محابا اس انداز سے استعمال کیا گیا ہے کہ طبیعت میں شگفتگی در آئی ہے اور پورا وجود خندۂ گل کی مانند نظر آتا ہے۔ اردو غزل کی تمام تر شیوگی، طرز ادا، اسالیب کا پھیلاؤ فارسی غزل سے برآمد کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میدان میں بھی چونکہ فارسی غزل کا اتباع ہے اس لئے حسن بھی وہی ہے۔ مثال کے طور پر عصری شعور کے حوالے سے یہ شعر دیکھئے:

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں
طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم

(حافظ)

انور شیخ کی غزل کی اس جہت کو دیکھئے تو ان کے یہاں بھی گردش روزگار کے حوالے سے بہت سی چیزیں ابھرتی ہیں جن میں زہاد، مرشد، شیخ و برہمن ان تمام کرداروں کو ہمارے سماج میں ایسا مقام حاصل ہے کہ وہ عوام کو فریب دے رہے ہیں۔ مرغ و ماہی کی ضیافتیں اڑا رہے ہیں۔ شیرینی قبول کر رہے ہیں اور ہر کس و ناکس پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں گویا کہ شب و روز کام و دہن کی ضیافت و تواضع میں مصروف ہیں۔ ان موضوعات کا حوالہ تو انور شیخ کے یہاں ہے ہی ابنائے زمانہ کے حوالے سے بہت کچھ ہے جو طنز کے دائروں میں سمٹ آیا ہے گویا ایک خندۂ استہزا ہے۔ معاشی عوامل پر، مذہبی عوامل پر، ایسے تمام عوامل پر جن پر دبیز رنگوں کے پردے پڑے ہیں حقیقتیں سامنے نہیں آپاتیں۔ انور شیخ نے ان حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔

غالب نے اپنے مذکورہ بالا فارسی شعر میں بھی اس شوخی کو روا رکھا ہے کہ شراب زہاد کو مت پیش کرو۔ یہ جوہر حیات ان کے لئے نہیں جن کی قسمت میں صرف زمزم کا کھارا پانی ہی پینا لکھا ہے بھلا وہ اس جوہر ناب کی قدر کو کیا سمجھیں گے۔ بظاہر تو یہ شعر طنزیہ ہے اس میں ہلکا سا مزاح بھی ہے جیسے کہ نمک در طعام لیکن اگر اس کے نشیب و فراز پر غور کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ سماج کے اس طبقہ کے لوگ جو پیری، مرشدی یا زہد میں اپنی زندگیاں بسر کر رہے ہیں دراصل سادہ لوح عوام کو فریب دے رہے ہیں اپنی شکم پروری کیلئے۔ شعر میں جوہر ناب زندگی کے حقائق کا استعارہ ہے اور شوراب زمزم استعارہ ہے اس تمام زندگی کا جس کے ظاہر و باطن میں فرق ہے۔ لفظ زمزم کے ساتھ شوراب کی ترکیب کا استعمال غالب کے اعلیٰ تخلیقی مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ فنکاروں میں بعض طبائع ایسی بھی ہیں جہاں سنجیدگی بھی بہت ہے اور شوخی بھی بہت ہے۔ ہزار شیوہ غزل کی ناز برداری کرنے والوں کے یہاں یہ سب کچھ ہے ورنہ ایک عام غزل گو تو بس اپنی محدود فکر سخن میں جیتا ہے اس سے آگے بڑھ نہیں پاتا۔ ہمارے سودا، میر، غالب کے یہاں بھی اس طرح کے اشعار مل جاتے ہیں جن میں عصری آہنگ کو

اس کے شعور کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ انور شیخ جن کے یہاں نظم و نثر دونوں میں شگفتگی ہے، بیباک اسلوب ہے، انہوں نے بھی خوب اس رنگ سخن کو آزمایا ہے۔ غزل کے اس امکان کی فصیل بلند پر بھی ان کا پرچم لہرا رہا ہے اور اس کے سائے میں زندگی کا ایک بڑا فلسفہ جس کے چہرے پر قرنوں کی سنجیدگی ہے، خیمہ زن ہے۔ مگر وہ اسے چٹکیوں میں اڑا رہے ہیں۔ محبوب سے بات چیت ہو، سیاست ہو یا پھر مذہب کے نام پر فریب کاریاں ہوں، ہر محاذ پر وہ ڈٹے ہوئے ہیں اور چومکھی لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اس جنگ میں ان کی تلوار کی جھنکار سب سے زیادہ نمایاں اور فضا گیر ہے:

جنہیں تم یار سمجھے ہو یہ سب فصلی بٹیریں ہیں
ہمیشہ اس کو بتلاؤں دلِ ناداں نہیں سنتا

پیر صاحب آپ کی قرأت سے کوے ڈر گئے
خود کو سمجھو خوش لحن کیا چار سو بیسی کا فن

نہیں جنس گراں مت پوچھ ملتی ہے کہاں سے یہ
جو ملتی ہے سر بازار وہ تو چار سو بیسی

ہیں گرگٹ تمہارے تغیر پہ حیراں یہ بتلاؤں کیسے تمہیں اے مری جاں
ارے پل میں یزداں ارے پل میں شیطاں جوالا مکھی ہو جوالا مکھی ہو

مریدوں کی کمائی تو ہڑپ لی پیر صاحب نے
یہ کیا کم ہے کہ کیا تعویذ کا احساں معاذ اللہ

غرض کیا زہد سے ہم کو نہیں جنت کے دیوانے
ہمیں جب ورغلاؤ تم بہت نمکین لگتی ہو

وصل کے وعدوں سے لیں مرشد نے تو شیرینیاں
جانتا لیکن نہیں ہے اب وہ ملوانے کا ڈھنگ

کہا مرشد نے گر تعویذ کا الٹا اثر تو کیا
دبا پاؤں دلوں کو تو گھمانا جانتے ہیں ہم

غزل میں طنز و مزاح اور شوخی تو ہمارے متقدمین کے یہاں بھی ہے لیکن انور شیخ اور دیگر شعرا کے یہاں جو چیز خط امتیاز کھینچتی ہے وہ ہے زبان کا بے محابا اور بے تکلفانہ استعمال۔ ان کے یہاں کوئی لفظ پست نہیں، حقیر نہیں۔ ہر لفظ تخلیقیت کی سطحوں کو کھولتا ہے۔ میں نے ان کے کچھ شعر پیش کئے ہیں۔ ان میں کئی ایسی چیزیں ہیں جیسے کہ فصلی بٹیریں۔ بٹیر ایک ایسا پرندہ ہے جو مخصوص موسم میں آتا ہے۔ وہ موسم اس کے جنسی اختلاط کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب نر و مادہ ایک دوسرے کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ انور شیخ بھی تعلق خاطر رکھنے والوں کو آگاہ کر رہے ہیں۔ خاص طور پر اپنے دل کو کہ جنہیں تو یار سمجھتا ہے اپنا دوست جانتا ہے وہ سب موسمی لوگ ہیں۔ فصلی بٹیروں کی اصطلاح نے شعر کو ایک خاص معنویت دی ہے۔ ان کے یہاں گرگٹ اور خر جیسے لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ مخلوق اپنی صفات سے پہچانی جاتی ہے۔ اگر انسان ان کی عادتیں اختیار کر لیتا ہے تو پھر انہیں سے اسے تشبیہ دی جاتی ہے انور شیخ نے بھی ان لفظوں کا استعمال اسی طرح کیا ہے یعنی بے وقوف، مکار اور عیار کے معنوں میں۔ ارسطو کا خیال ہے کہ ہم جس چیز کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں وہ بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ مجھے بھی کبھی بے حد حیرت ہوتی ہے جب انسانوں کے مزاج کو جانوروں کے مزاج سے قریب پاتا ہوں۔ انور شیخ نے اس کو اس انداز سے ممیز کیا ہے کہ اصل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ حضرت شیخ ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور واقعہ کشف المحجوب میں درج ہے کہ آپ اپنے حجرے سے باہر نہیں نکلتے تھے ایک عقیدت مند نے جب بہت اسرار کیا تو فرمایا کہ شہر میں دیکھنے کے قابل کچھ نہیں ہے کیا دیکھوں۔ عقیدت مند کو حیرت ہوئی تب حضرت اپنے ساتھ اس شخص کو لے گئے تو اس نے دیکھا کہ بھرے پرے دلنواز خوبصورت شہر میں چاروں طرف بھانت بھانت کے جانور امڈے چلے آرہے ہیں۔ شیر، بکری، بھیڑیا، گرگٹ

کتا، گدھا، کوا، بیل، خنزیر وغیرہ۔ وہ شخص سوچ میں پڑ گیا کہ یا اللہ یہ شہر تو خوبصورت انسانوں کی بستی تھا، یہ کیا بوالعجبی ہے کہ مویشیوں اور چرند و پرند کا انبوہ کثیر نظر آتا ہے۔ حضرت اپنے حجرے میں واپس آئے، فرمایا، تم نے دیکھا، یہ اس مخلوق کا باطن ہے جن کے چہرے انسانوں جیسے ہیں مگر اندر سے وہ جانوروں کے مماثل ہیں۔ بہر حال میں نے تو یہ ایک مثال عرض کی مگر آج کے زمانے میں جبکہ درویشی اور سلطانی دونوں عیاری بن چکی ہیں ظاہر ہے کہ ان حالات میں ایک شریف النفس انسان کیا کرے گا اور پھر شاعر جو کسی طرح اپنے لفظوں کو جوڑ کر اپنی بات کہتا ہے اور سکون حاصل کر لیتا ہے۔ انور شیخ نے اس رنگ سخن کو اپنی غزلوں میں خوب پیش کیا ہے اور تمام نقوش ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کے مضامین کے زیر اثر ان کے یہاں فصل شباب کی رخصت کا نوحہ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ شئے ہے جو گم ہو جانے کے بعد کبھی نہیں ملتی۔ شباب بے حد خوبصورت اور لذت انگیز زمانے کا نام ہے لیکن ایک مخصوص عہد میں وہ رخصت ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں آتا اور انسان اپنی آخری سانس تک اس کا نوحہ خواں اور مرثیہ خواں رہتا ہے گویا کہ بین کرتا ہے ان لمحوں کو یاد کر کے کیونکہ شباب جس تجربہ سے اسے گزارتا ہے اس تجربہ سے دنیا کی کوئی شئے انسان کو گزار نہیں سکتی۔ انور شیخ کے یہاں اس کا نوحہ بھی ہے لیکن اس فارسی شعر کی کیفیت بھی ہے جس میں ایک امید ہے کہ کس طرح کچھ دیر کے لئے وہ لمحہ واپس آ جائے جو جسم و جاں پر پوری طرح محیط ہو:

گر چہ پیرم تو چناں تنگ بہ آغوشم گیر
کہ سحر گہہ بہ کنار تو جواں برخیزم

(حافظ)

حالانکہ یہ بحث ایک لمحاتی لذت کی یا فنگی کی طرف اشارہ ہے۔ اس بہانے عاشق کچھ دیر اپنی بوڑھی ہڈیوں کو محبوب کے جوان جسم کے لمس سے گرم کرنا چاہتا ہے۔ انور شیخ کے یہاں اس قسم کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ ان اشعار میں عہد شباب کی یادیں بھی ہیں، اس کی مستی بھی ہے اور اس موسم دلنواز کے رخصت ہو جانے کا نوحہ بھی ہے:

تو جبکہ میرے پاس تھا مجھ کو نہ کچھ احساس تھا
پیری تو ہے اک اژدہا رفتہ شباب لوٹ آ

پیری میں بن گئی سزا ہر چیز وہ ندیم
لگتی تھی جو کہ اک جزا جوش شباب میں

ذرا دیکھو تو اے جانم بوڑھاپے میں جواں ہیں ہم
کہو کوئی کہاں ہے خم بوڑھاپے میں جوانی میں

بوڑھاپا اک مرض ہے ایک درد لا دوا ہمدم
جوانی ہے مگر مرہم جوانی کی سنا باتیں

بوڑھاپا بھی جوانی سے نہیں کم یہ اگر سمجھے
کہ خوں ہے ایک زیرو بم جوانی کی سنا باتیں

ان موضوعات کے اشعار میں بے حد شگفتگی ہے جس سے خاص احساس ہوتا ہے کہ شاعر اس عمر میں بھی جوان ہے۔ انہوں نے اپنی شعری کتاب ''نوائے دل'' کے دیباچے میں لکھا بھی ہے:

''غزل اردو کا یقیناً ایک بیش قیمت گراں مایہ سرمایہ ہے مجھے ہمیشہ ہی اس سے والہانہ عقیدت رہی ہے اور اسی لئے اس کی رسم محبت کو ہمیشہ ہی نبھانے کی کوشش کی ہے۔ بدقسمتی سے میرے ناقدین کو میری غزل گوئی پر اعتراض یہ ہے کہ ایک پچھتر سالہ بوڑھے کیلئے جذباتی شاعری جائز نہیں۔ ان احمقوں سے کون کہے کہ دل شاعر کبھی بوڑھا نہیں ہوتا اور جس دل میں جذبات کی لہریں جنم لینا بند کر دیں وہ دل دل شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ غزل بنیادی طور پر دل کی شاعری ہے۔''

یقیناً یہ تجزیہ بے حد وقیع ہے اور ناقدین ادب کے سمند فکر پر ایک تازیانہ بھی۔ کیونکہ میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ شباب ایک اُبال کا نام ہے اور یہ کہ جذبہ کی پختگی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب شباب کا قافلہ نظروں سے اوجھل ہو چکا ہوتا ہے۔ کیونکہ شباب تو مسلسل

ابلتا ہے۔ایک تواتر کے ساتھ آگ میں تیل ڈالتا رہتا ہے لیکن جب یہ آنچ مدھم ہوتی ہے تو پھر بے حد لذت انگیز ہوتی ہے۔کم از کم میرا ذاتی تجربہ تو یہی ہے اور شاید یہی ہے بھی۔اس کی مثالیں یوں بھی دیکھنے میں آتی ہیں کہ بعض صنف نازک نوجوان ہونے کے باوجود پختہ عمر کے مردوں سے راہ و رسم رکھنا پسند کرتی ہیں کیونکہ یہ عمر توازن اور اعتدال سے بھری ہوتی ہے اور جذبہ کا قیام تادیر رہتا ہے۔میں انور شیخ کے اس خیال سے سو فی صدی متفق ہوں کہ شاعر کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

بات غزل میں طنز کی چل رہی ہے۔اس کی مثال ہمارے یہاں ہر عہد میں ملتی ہے فارسی شعراء کے یہاں بھی اور اردو شعرا کے یہاں بھی۔بس بات یہی ہے کہ انور شیخ کے یہاں الفاظ کا بے محابا استعمال ہے۔متقدمین اور متوسطین کے یہاں سے بھی چند مثالیں پیش ہیں:

زاہد نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

(غالب)

دی فرصت گناہ مگر وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

(فیض)

جام مئے کیا تراقے سے ٹوٹا
شیخ تیری بھی پتھر نظر ہے

(فراق)

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

(جگر)

یہ کالی کالی گھٹا یہ ساون فریب زاہد الٰہی توبہ
وضو میں مصروف ہے بظاہر حقیقتاً ہاتھ مل رہا ہے

(شکیل بدایونی)

انور شیخ کے یہاں بھی اس طرح کے نمونے موجود ہیں جن میں الفاظ کی بیساختگی اور بے محابا پن صاف ظاہر ہے:

ولی ہو یا کہ شیطاں ہو فقیہ شہر کا دعویٰ
ارے فتووں سے سب کو ورغلانا جانتے ہیں ہم

خطیب تم تو سناؤ ہم کو ہمیشہ ہی داستانِ دوزخ
بنے کٹھن جس سے زندگانی نہ ہم کو ایسی کتھا سناؤ

تمہارے بادۂ جنت کی باتیں صرف باتیں ہیں
نرالا ہے مزا ناصح شراب ارغوانی میں

ارم اک استعارہ ہے نہ حوریں ہیں نہ غلماں ہیں
بھلے زاہد وہاں ہوں کب وصال یار کی باتیں

الفاظ کی تکرار کا حسن بھی انور شیخ کے یہاں بے حد موجود ہے۔ لفظ ایک جادوگر ہے۔ اس میں غنائیت بے مثال ہوتی ہے لیکن بعض الفاظ اگر مسلسل شعر میں آجائیں تو اس کا حسن دوبالا کر دیتے ہیں۔ ہمارے اساتذۂ فن اس کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ قدیم عہد میں شعر کی صنعت منقوطہ و غیر منقوطہ صنعت واصل الشفتین یا غیر واصل الشفتین اس کی اہم مثالیں ہیں۔ اب یہ طریقہ تقریباً ختم ہو چکا ہے لیکن لفظی تکرار کا حسن ہمیں انور شیخ کے یہاں ملتا ہے۔:

بھٹکتا ہوں میں حسنؔ کی وادیوں میں مگر میں نہ سمجھا تمہاری زباں کو
ہمیشہ کہا تم نے اے آبشارو محبت محبت محبت محبت

نشیلے خواب وصل یار کا ہیں کارگر نسخہ
علاج سوز فرقت ہے غٹاغٹ پی غٹاغٹ پی

یہ جذبات کیا اک عجب سی کہانی حقیقت میں آتش لگے گل فشانی
ارے مہ رخوں کا یہی تو ہے تیشہ تغافل تغافل تغافل تغافل

لمبی لمبی ردیفیں، الفاظ کا آہنگ، صوتی تکرار، غنائی جھنکار، یہ سب انور شیخ کی غزل کا حسن ہیں۔ گویا یہ ان کی فکر کا ایک طرۂ امتیاز بھی ہے۔ لمبی لمبی ردیفوں کا اپنا ایک آہنگ ہوتا ہے جیسے کہ، نہ میں الو نہ تم الو، نہ میں مومن نہ تم مومن، ہم بھی کبھی جواں تھے، کہو جی کیا سنا تم نے، اب آ بھی جا اب آ بھی جا، جوالا مکھی ہو جوالا مکھی ہو، اس طرح کی ہزاروں ردیفیں ان کے یہاں بکھری پڑی ہیں جن میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ بھی ہے شباب کے عہد رخصت کے بعد بھی ایک شعلے کی تھرتھراہٹ ہے چونکہ انور شیخ نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انہوں نے دیکھا ہے کہ مذہب کے نام پر لوگ کس طرح اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں کس طرح سادہ لوح اور ناخواندہ عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے کس طرح شکم پروری کی جا رہی ہے۔ کس طرح سالوس باطن انسانوں نے درویشی کا جامہ زیب تن کر لیا ہے، کس طرح مختلف گم کردہ راہ اذہان عوام کو اپنے قدموں پر جھکا رہے ہیں اور مذہب کے حوالے سے غلط تعلیم کی دھن میں انہیں گمراہ کر رہے ہیں۔ وہ خود بھی اپنی شکم پروری کیلئے اسی دھن میں کھوئے ہیں اور یہی لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ شاعر کا کہنا ہے کہ ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ علم کی روشنی حاصل کرنی چاہئے تاکہ اس کی گہرائیوں تک پہنچ کر حقیقت اور فریب کے درمیان خط امتیاز کھینچا جا سکے۔ کہیں کہیں ان کے لہجہ میں شوخی کے ساتھ گہرا طنز بھی در آیا ہے۔ کہتے ہیں:

لے کے باہوں میں مریدن کو کہا مرشد نے یوں
یہ ہے روحانی شراکت اس کو شیطانی نہ کہہ

یہ مداری شیطنت میں تو مرا بھی باپ ہے
دیکھ کر ملا کو خود گھبرا گئے شیطان جی

تھیٹر یا سنیما میں لوگوں کا تالیاں بجانا یا اشک بہانا اس شدت جذبات کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ کسی شعلہ بیان مقرر کی تقریر بھی اس لئے مؤثر ہوتی ہے کہ اس کی آواز چہرے کی نمائش اور ہاتھوں کی حرکت میں وہی ڈرامائی انداز ہوتا ہے جو ایک ایکٹر یا ایکٹریس کی اداکاری میں ہوتا ہے۔

تکونی اپنی ڈرامائی نوعیت کے سبب ایسی ہی تاثیر کی خواہاں ہے لیکن عدالتی کاروائی سے مشابہ ہونے کے باعث عدل کی حامی ہے جس سے تعلّی کی روک تھام ممکن ہے اس کی ساخت جو اسے تین بندوں تک محدود رکھتی ہے اس کے پیغام کو مصنوعی جوش وخروش سے بچا کر منطقی طور پر پیش کرنے کی آرزومند ہے کہ اس کی جذباتی اپیل قاری کی قوت فکر کو دوبالا کرے نہ کہ اسے الّو کو باز کہنے کی ترغیب دے۔''

تکونی سے متعلق انور شیخ کی تحریر کے اس طویل اقتباس کو پیش کرنے سے دراصل میرا مقصد یہ ہے کہ اس کا پتہ چلے کہ تکونی اور غزل میں قدر مشترک کیا ہے، قدر مشترک مکالماتی اسلوب ہے، ڈرامائی انداز ہے، غزل بھی جب اس انداز سے کلام کرتی ہے تو قد آور نظر آتی ہے، غزل کا یہ انداز بھی انور شیخ کی غزلوں میں ہے جس کا ذکر آگے آئے گا شاعر چونکہ اپنے عصر سے مکالمہ کرتا ہے فارم خواہ کچھ بھی ہو تو انداز استفساری ہوتا ہے۔ بہت سی باتوں کا وہ خود جواب دیتا ہے بہت سے سوال قاری کی فہم ودانش سے وابستہ ہوتے ہیں اسے جواب دینا ہوتا ہے بہر حال تکونی کو اگر ہم ایک عصری مکالمہ کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ میں اس سلسلے میں انور شیخ کی ایک تکونی آگ اور پانی پیش کرتا ہوں:

آگ (پانی سے):

زندگی کا راز ہوں میں سوز ہوں میں ساز ہوں
اور اے پانی فقط ڈھلوان پر بہتا ہے تو
جنبش پیہم ہوں سرِّ قوت تخلیق ہوں
ناتوانی سے مگر ہموار ہی رہتا ہے تو

عجب واعظ لگاؤ ہم پہ فتوے بت پرستی کے
روا کہیئے کہ خود اصنام کو دل میں بساتے ہو

جب کیا تعویذ مرشد کا گلہ کہنے لگے
کفر سے بدتر یہ جرأت مت ہمیں حضرت کہو

غضب کا یہ ہنر شیرینیاں لینے کا اے مرشد
نہیں کچھ تو یہی چکر سکھاتا جا سکھاتا جا

اگر اس کوچے میں مکاروں عیاروں کی بھیڑ نہ ہوتی تو ظاہر ہے کہ شعراء افسانہ نگار اور تخلیق کار ملا، واعظ، پیر مرشد کو اس طرح نشانہ کیوں بناتے۔ دراصل زندگی کی حقیقتوں سے عوام کو ہٹا کر ایک ایسی دنیا کی طرف انہیں لے جانے کا عمل ہے جس کا سلسلہ اگر شروع ہوتا ہے تو مرنے کے بعد لیکن اس میں کسی کی سفارش، کسی کی منت، کسی کی دسترس کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ ایک ماندگی کے وقفہ کو گزار کر آگے دم لیکر چلنے کی کیفیت ہے لیکن فارسی اور اردو شاعری میں بہر حال یہ ایک موضوع رہا ہے اور اس پر خوب خوب خامہ فرسائی ہوئی ہے لیکن ایسی تخلیقات میں حقائق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عمر خیام نے کچھ یوں کہا ہے:

شیخے بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی
کز خیر گزشتی و بہ شر پیوستی
زن گفت چناں کہ می نمایم ہستم
تو نیز چناں کہ می نمای، ہستی؟

زنِ فاحشہ کی زبان سے شیخ کے کردار کو واضح کرنا ظاہر ہے کہ کیا کردار ہوگا جسے یہاں بیان کیا گیا ہے۔ غالب نے بھی شیخ و برہمن پر بڑی تنقیدات کی ہیں:

نہیں ہے سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

داغ نے ناصح کو خطاب کرتے ہوئے اپنی زبان کی تراش وخراش اور اس کا جلوہ کچھ یوں دکھایا ہے:

ناصحا تو بھی کسی پر جان دے
ہاتھ لا استاد، کیوں کیسی کہی؟

لیکن زہاد، شیوخ، مرشدانِ گرامی و پیرانِ عیار طبع پر سب سے زیادہ کھل کر جوش ملیح آبادی نے اظہار خیال کیا ہے ٹھیک وہی کیفیت انور شیخ کے یہاں بھی ملتی ہے۔ میں اس سلسلہ میں چند رباعیات جوش اس کے حوالے سے پیش کروں گا کہ اصل تصاویر شیوخ ان کے کردار اور ان کی خانقاہوں کی فضا سامنے آجائے:

حیرت کی نظر سے آستانے دیکھو
جاری ہیں ریا کے کارخانے دیکھو
شیطان کی انگلیوں میں گردش کرتے
زہاد کی تسبیح کے دانے دیکھو

یہ رشتۂ تسبیح ہے ہم پھندے ہیں
ہر عیب سے یہ پاک ہیں ہم گندے ہیں
اس طرح نکل رہے ہیں مسجد سے شیوخ
گویا یہ خدا ہیں اور ہم بندے ہیں

کیا شیخ کی تلخ زندگانی گزری
بیچارے کی اک شب نہ سہانی گزری
دوزخ کے خیال میں بڑھاپا بیتا
جنت کے خیال میں جوانی گزری

ہم دیکھ کے ان بتوں کو کیا کہتے ہیں
اتنا ہی کہ بس صل علیٰ کہتے ہیں
لیکن یہ فقیہانِ حرم بایں ریش دراز
موقع ہو تو ہر بت کو خدا کہتے ہیں

انصاف بتوں کی چاہ دینے والے
حسن ان کو مجھے نگاہ دینے والے
کس منھ سے مجھے حشر میں دے گا تعزیر
دل کو ترغیب گناہ دینے والے

ظاہر ہے کہ اہل دانش وبینش اس معاملہ میں کسی سے مصالحت نہیں کر پاتے وہ حقیقی زندگی گزارتے ہیں اسی کے خواہاں ہوتے ہیں اور وہی سب کچھ دوسروں کے پاس دیکھنا پسند کرتے ہیں جو ان کے پاس ہوتا ہے۔ اگر ذرا بھی جھوٹ مکاری اور عیاری نظر آتی ہے تو ان کی طبیعت میں کبیدگی اور پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ غالب نے بھی اللہ سے کچھ اسی طرح کا سوال کیا ہے:

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

چونکہ انور شیخ ایک حقیقت پسند فنکار ہیں اسلئے انہوں نے جگہ جگہ سماج کے اس رستے ہوئے ناسور پر انگلی رکھی ہے:

سجدوں میں بھی ترے ہی تصور میں منہمک
جیسے کہ تو ہی کبریا، آنکھیں نہ یوں دکھا

روز جزا پوچھے گا تو سجدے نہ کیوں اس کو کئے
فکر شکم سے کب ملی فرصت، کہوں گا روبرو

عداوت بھی ہے مکاری محبت بھی ہے مکاری
کریمی میں ستم مضمر کہو یہ کیا گھٹالا ہے

مے کشی آنکھیں لڑانا گل رخوں سے چھیڑنا
یہ تو ہیں اطوار جنت اس کو شیطانی نہ کہہ

انور شیخ کی تمام تر شاعری ایک خاص نظریے پر محیط ہے اور وہ ہے حقیقت نگاری خصوصاً ان کی غزل کا مطالعہ و تجزیہ کرتے وقت مجھ پر کئی جہانوں کے راز فاش ہوئے لیکن دشت بے کنار میں مجھے چاروں طرف حقیقت کے چراغ روشن نظر آئے۔ ہوسکتا ہے کہ ناقدین ادب صرفی ونحوی اعتبار سے عروض وقافیہ، بحور واوزان کے نقطۂ نظر سے ان کی شاعری پر کچھ حرف گیری کریں مگر یہ کوئی خاص بات نہیں۔ طرز ادا، مضمون کی ادائیگی بڑی چیز ہوتی ہے باقی چیزیں تو اسے سنوارنے نکھارنے اور کیل کانٹے سے درست کرنے کا انداز رکھتی ہیں۔ اس سلسلہ میں جہاں کہیں انہوں نے اپنی شاعری غزل یا دیگر اصناف سخن پر اظہار خیال کیا ہے اس سے ان کے مزاج کی اصل کا پتہ چلتا ہے۔ طنز و مزاح ہو یا رومانیت ہر جگہ انہوں نے بڑے بڑے موضوعات اٹھائے ہیں حالانکہ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ وہ عمر کی اس منزل تک پہنچ چکے ہیں جہاں بادی النظر میں نقوش بصارت کے دائرے دھندلے ہونے لگتے ہیں لیکن نگاہ بصیرت کی درخشانی بڑھ جاتی ہے۔ ہر نقش تابناک ہوتا ہے تجربہ تیز ہو جاتا ہے ایسا لگتا ہے کہ جیسے انور شیخ یہ کہہ رہے ہوں:

بیار بادہ کہ مینائے عمر لبریز است
مریض را دم آخر چہ جائے پرہیز است

میں اس موقع پر علی دانش کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہوں گا۔ اقتباس یوں ہے:

''یہی وہ قطرہ ہے جو وسعت دجلہ کو حصار میں لئے ہوئے ہے۔ یہی وہ خیال ہے جو حالت بیخودی میں بھی خرد کا دامن ہاتھ میں

تھامے رکھتا ہے، یہی وہ کیف وسرور ہے جو ایک درویش مست عالم وجد میں محسوس کرتا ہے، یہی وہ بصیرت ہے جو عالم کائنات کو انگنت رنگوں کی صورت میں چشم تماشا پر آشکار کرتی ہے، یہی وہ راستہ ہے جس سے جزو، کل کے ساتھ باہم آمیز ہو جاتا ہے اور یہی امتزاجی تنقید کا وہ فطری نظام ہے جس کے بغیر تکمیل انسانیت ناممکن ہے۔''

میں نے انور شیخ کی غزل کا تنقیدی وتقابلی مطالعہ لکھ کر محض ایک داغ بیل ڈالی ہے کیونکہ ابھی بہت کچھ کام ہونا باقی ہے اور اب جبکہ میری بات اپنے نقطۂ اختتام کو پہنچ رہی ہے تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ان صفحات میں انور شیخ کی غزل کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ سفر آفاقی ہے۔ یہ شاہراہ لامتناہی ہے۔ اس میں ہزاروں سنگ میل ہیں اور میں اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

(غالب)

***

انور شیخ ایک نظر میں

(حصہ اول)

خاندانی نام	:	حاجی محمد انور
ادبی نام	:	انور شیخ
پیدائش	:	یکم جون ۱۹۲۸ء بروز جمعہ
مقام پیدائش	:	''ملک پور چاہڑا (انور شیخ صاحب کا ننہال ہے)
والد محترم کا نام	:	جناب غلام سرور (مرحوم)
والدہ محترمہ کا نام	:	محترمہ فضل بیگم (مرحومہ)
بھائی بہن	:	انور شیخ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے ہیں
خانہ آبادی	:	(۱) محترمہ اقبال بیگم (لالہ موسیٰ ضلع گجرات، پاکستان) (۲) محترمہ جولیا (انگریز ویلز، برطانیہ)
اولاد	:	ایک بیٹا دو بیٹیاں
وطن	:	(۱) ''لالہ موسیٰ'' (ضلع گجرات، پنجاب، پاکستان)
وطن ثانی	:	(۲) ''کارڈف'' برطانیہ
تعلیم	:	• میٹرک (۱۹۴۶ء لالہ موسیٰ) • ادیب فاضل (۱۹۴۹ء پیشاور) • منشی فاضل (۱۹۵۰ء پیشاور)

- بی۔اے۔(۱۹۵۳ء پیشاور)
- بی۔ٹی۔(۱۹۵۵ء پیشاور یونیورسٹی)
- مولوی فاضل (امتحان کی مکمل تیاری کرے چکے تھے لیکن امتحان سے قبل ۱۹۵۶ء میں برطانیہ چلے آئے)
- گریجویٹ شپ ان ٹرانسپورٹ لندن (برطانیہ) ۵۸-۱۹۵۷ء

نوٹ: - مذاہب عالم، فلسفہ اور دیگر علوم کا حصول انور شیخ کی مسلسل ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ہجرت : انور شیخ ۱۹۵۶ء میں برطانیہ چلے آئے اور تا حال برطانیہ کے ایک شہر 'کارڈف' میں مع اہل وعیال کے سکونت پذیر ہیں۔

ذریعۂ معاش :
- ''لاہور'' میں دو سال تک ریلوے کلرک رہے۔
- ''لالہ موسیٰ'' میں کریانہ اسٹور کھولا اور ناتجربہ کاری کے سبب جلد ہی بند کرنا پڑا۔
- پیشاور میں اکاؤنٹس کلرک رہے اور درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، ''برطانیہ'' میں کچھ سالوں تک محنت مزدوری کی۔
- ''کارڈف شہر میں ملازمت کی اور جائداد کی خرید وفروخت اور تعمیر کا کام ۲۵ رسال تک محنت اور لگن کے ساتھ کیا۔''

تلمذ : تلمیذ الرحمٰن ہیں۔
(اس لئے انور شیخ کو کسی کی شاگردی کا فخر حاصل نہیں)

تخلیقی اظہار : اردو، انگریزی زبان وادب

اصناف (اُردو) : نظم ونثر، تحقیق وتنقید

ایجاد کردہ شعری اصناف : (۱) تکونی (۲) کہمن (۳) متضاد نظم (۴) غزالہ (۵) منظومہ (۶) محبوبہ (۷) مکرولی (۸) مکرولچہ (۹) تلخی

خصوصی اصناف سخن : (۱) مکالمہ (۲) تمثیلچہ (ڈرامچہ)

مطبوعات اردو:

۱۔ فلسفۂ ازدواج
۲۔ رازِ حیات
۳۔ جہادِ بالسیف
۴۔ ربِّ اسلام
۵۔ اقبال ایک اسلام شکن شاعر
۶۔ اقبال اور تضحیکِ وطن
۷۔ علامہ اقبال...غارت گرِ ملّت
۸۔ اقبال کا نظریۂ عقل و عشق
۹۔ فکرِ اقبال پر تنقیدی نظر (اردو اور ہندی)
۱۰۔ نبضِ جہاں (شعری مجموعہ)
۱۱۔ فتنۂ قادیانی
۱۲۔ آگ اور پانی (شعری مجموعہ)
۱۳۔ غزالہ (ایک نئی صنفِ سخن)
۱۴۔ رازِ نیاز (شعری مجموعہ)
۱۵۔ منظومہ (ایک نئی صنفِ سخن)
۱۶۔ سوز و ساز (شعری مجموعہ)
۱۷۔ محبوبہ (ایک نئی صنفِ سخن)
۱۸۔ نوائے دل (شعری مجموعہ)
۱۹۔ مکرولی (ایک نئی صنفِ سخن)
۲۰۔ غبارِ دل (شعری مجموعہ)
۲۱۔ شرارِ دل (شعری مجموعہ)

مطبوعات انگریزی:

1. Taxation and Liberty
2. Eternity
3. Faith and Deception
4. Islam, the Arab Nationalism
5. Islam, Sex and Violence
6. The Tale of Two Gujrati Saints
7. Islam and Human Rights
8. Is Islamic Law a Factor Fiction
9. Mother India and the Vedic Principle of Power
10. This is Jehad
11. Sexual Conflict
12. The Vedic Civilisation

اردو اور انگریزی صحافت: سہ ماہی ''لبرٹی'' کارڈف برطانیہ (اردو انگریزی میں ایک ساتھ)

انور شیخ کے فن و شخصیت پر لکھی گئی کتابیں:

۱۔ ''انور شیخ بحیثیت شاعر''	از: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۲۰۰۰ء
۲۔ ''انور شیخ بحیثیت افسانہ نگار''	از: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۲۰۰۰ء
۳۔ ''تکونیاں'' (انتخابات) (انور شیخ کی ایجاد کردہ شعری صنف)	از: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۲۰۰۰ء
۴۔ ''کہمن'' (انتخاب) (انور شیخ کی ایجاد کردہ شعری صنف)	از: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۲۰۰۲ء
۵۔ ''انور شیخ: مطالعہ در مطالعہ''	از: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۲۰۰۲ء
۶۔ ''علامہ اقبال منفی پہلو'' (انور شیخ سے طویل انٹرویو)	از: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۲۰۰۰ء
۷۔ ''انور شیخ کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ''	از: ڈاکٹر مظفر حسن عالی	۲۰۰۱ء
۸۔ ''انور شیخ شاعر و افسانہ نگار''	از: ڈاکٹر غزالہ ناروی	ستمبر ۲۰۰۲ء
۹۔ ''انور شیخ اور ان کے کارنامے''	از: ڈاکٹر سیفی سرونجی	اپریل ۲۰۰۳ء
۱۰۔ ''انور شیخ کی ایجاد کردہ شعری اصناف''	از: ڈاکٹر فراز حامدی	۱۲ جولائی ۲۰۰۳
۱۱۔ ''انور شیخ: مجدد فکر و نظر''	از: نقوش نقوی، کراچی پاکستان	۲۰۰۳ء
۱۲۔ ''احتساب'' (انور شیخ کی غزل کا تنقیدی و تقابلی مطالعہ)	از: عشرت ظفر، کانپور (انڈیا)	۲۰۰۴ء

نوٹ:- کچھ کتابیں زیر ترتیب اور زیر طبع بھی ہیں۔

گوشۂ انور شیخ :
- سہ ماہی ''کوہسار جرنل'' بھاگلپور... ماہ اگست ۱۹۹۹ء
- سہ ماہی ''سفیر اُردو'' لندن ۲۰۰۲ء مدیر اعلیٰ ساحر شیوی
- سہ ماہی ''انتساب'' سرونج (بھارت) مدیر: ڈاکٹر سیفی سرونجی
- سہ ماہی ''سخنور'' کراچی۔ مدیر: نقوش نقوی
- ماہنامہ ''انشاء'' کولکاتہ۔ مدیر: ف۔س۔ اعجاز

● سہ ماہی ''ترسیل''، ممبئی۔ مدیر اعلیٰ: ساحر شیوی۔ مدیر: یونس اگاسکر
(کچھ اور رسائل بھی انور شیخ نمبر شائع کرنے کا مصمم ارادہ کئے ہوئے ہیں)

بحیثیت سرپرست :

۱۔ سہ ماہی ''سفیر اُردو'' لندن ۲۔ سہ ماہی ''انتساب'' سرونج (بھارت)
۳۔ ماہنامہ ''پرواز'' لندن ۴۔ سہ ماہی ''ترسیل''، ممبئی (بھارت)

خصوصی معاون : دی پرنس پیلیٹی پبلشرز۔ پی۔ او۔ بکس ۹۱۸، پینارتھ روڈ
پوسٹ آفس کارڈف، سی۔ ایف ۵۔ ۲۔ این۔ ایل۔ (یوکے)
(اس اشاعتی ادارے سے کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں)

(حصہ دوم)

❖ انور شیخ اپنی ماں کے پہلے بچے ہونے کے سبب ان کی پیدائش خاندانی رسم و رواج کے مطابق ان کے ننھیال میں ہوئی، ان کا ننھیال ملک پور میں ہے، چونکہ ملک پور چاہڑا سے جڑا ہوا ہے، اس لئے ملک پور چاہڑا کے نام سے مشہور ہے اور یہ ضلع گجرات، پنجاب، پاکستان میں واقع ہے۔

❖ انور شیخ کے خاندان کی طرز رہائش اگرچہ روایات کے لحاظ سے پنجابی تھی لیکن اس کا ہر لمحہ اسلامیات میں ڈوبا ہوا تھا، اس کا اطلاق نہ صرف موصوف کے نانا پر ہوتا تھا بلکہ ان کی والدہ محترمہ اور تمام اہل خانہ اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

❖ انور شیخ کے نانا اور دادا دونوں ہی کشمیر کے برہمن خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پردادا مشرف بہ اسلام ہوئے جن کا تعلق سری نگر سے تھا اور یہ پیشے سے پروہت تھے، چنانچہ ان کے پردادا پنجاب میں وارد ہوئے تو اسلامی علوم سے آراستہ ہو کر امام مسجد بن گئے۔

❖ انور شیخ کے دادا مرحوم کے چھوٹے بھائی مولانا تاج الدین جو کہ ایک عظیم عالم تھے، عمر بھر پیشۂ امامت سے وابستہ رہے، ان کے اہل خانہ سُنّی مسلمان تھے۔

میں شعاعِ مہر نور ماہ تاروں کی ضیا
بار تاریکی مگر کیوں شوق سے سہتا ہے تو
زندگی ہے آگ ،لیکن آب ویرانی کا ناگ
جو کہ ڈس لیتا ہے بے دردی سے ہستی کا سہاگ

پانی (آگ سے):

جس کو دعووں کی لٹک اک بندۂ دیوانگی
اس کو کب ہونا ہے اے آتش زباں پر اختیار
یہ حقیقت زندگی کا راز تو پانی میں ہے
کوئی چھوٹا یا بڑا سب کا ہوں میں پروردگار
جانتے ہیں سب کہ تو دوزخ ہے میں خلد بریں
تو ہے ریگستان میں رنگینیٔ فصل بہار
وقت آخر آب کی کرتا ہے ہر اک التجا
اور کہتا ہے خدایا مجھ کو آتش سے بچا

مبصر:

زندگی آتش نہ پانی، رازداں کی زندگی
درحقیقت ایک رنگیں آب و آتش کا وصال
آگ جل کر اعتدال نسبتی پر منحصر
سوز ہستی ساز عشرت شوخی حسن و جمال
دست قدرت سے مقرر ہو چکی ہر شئے کی حد
جس کو ہو شوق تجاوز اس کی قسمت میں ملال
احترامِ اعتدالِ زندگی وہ ساز ہے
جس میں مضمر شادمانی کا سہانا راز ہے

خوبی اس تکونی کی یہ ہے کہ آگ و پانی کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعے کو

- انور شیخ کی والدہ محترمہ قرآن وحدیث سے اچھی طرح واقف تھیں، انہیں قرآن کا بیشتر حصہ زبانی یاد تھا، صوم وصلوٰۃ اور پرہیز گاری میں وہ اپنی مثال آپ تھیں، اسکے برعکس ان کے والد محترم اور ان کے تینوں بھائی صرف نام کے مسلمان تھے، اگر چہ وہ اسلام کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔
- انور شیخ اپنی والدہ محترمہ کے علاوہ مولانا تاج الدین صاحب سے بھی خاصے متاثر رہے اور ان سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا بھی، مولانا تاج الدین مفتی ہونے کے باوجود لکیر کے فقیر نہیں تھے، ان کی اسلام فہمی میں دانش کو دخل حاصل تھا۔
- انور شیخ نے مقامی مسجد سے بھی استفادہ کیا اور تعلیم کا آغاز ''کریما بہ بخشائے برحالِ ما'' سے ہوا۔
- انور شیخ کے نانا مرحوم ایک نیک اور دیندار انسان تھے، جب وہ بچے کی ولادت کا سن کر تشریف لائے تو وہ ان کے انداز پیدائش سے بڑے متاثر ہوئے، انہوں نے کہا شاید یہ بچہ بڑا ہو کر نمایاں اور قابل قدر کام انجام دے، لہذا انہوں نے ان کا نام حاجی محمد انور رکھ دیا، چونکہ انور شیخ بروز حج پیدا ہوئے تھے لہذا ان کے نام سے پہلے حاجی لگایا جاتا ہے یعنی حاجی محمد انور۔
- ملک پور چاہڑا، انور شیخ کا ننہال ہے، اس گاؤں سے تقریباً چار پانچ میل کے فاصلے پر ''لالہ موسیٰ'' شہر واقع ہے، جہاں ان کے والد سکونت پذیر تھے، انور شیخ کے دادا مرحوم کا قدیمی گاؤں گجرات شہر سے غالباً تین چار میل کی دوری پر تھا اور ''پکھووال'' کہلاتا تھا۔ ان کے دادا مرحوم نے ''لالہ موسیٰ'' شہر کو مسکن کے طور پر چنا۔
- پیشاور میں انور شیخ نے ''انجمن تدریس القرآن'' کی بنیاد رکھی، یہ اس انجمن کے پہلے سکریٹری بھی تھے، اس دور میں انہوں نے مختلف اسلامی موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں جن میں درج ذیل شائع ہوئیں:

۱۔ فلسفۂ ازدواج ۲۔ رازِ حیات ۳۔ ربِ اسلام ۴۔ جہاد بالسیف

- جب انور شیخ صاحب کا کاروبار نقطۂ عروج پر پہنچا تو ان کے دل میں پھر وہی آرزو انگڑائیاں لینے لگی جس کی تکمیل کیلئے وہ عالم جوانی میں بھی کوشاں رہے یعنی ''شوقِ علم و

ادب'' گرچہ فرصت کی گھڑیوں میں ان کا مطالعہ ہمیشہ جاری رہا لیکن ان کے ذوقِ جستجو نے کچھ ایسے مقام کے خواب دکھائے کہ معمولی مطالعہ اور دقیانوسی علم کے سہارے اس مقام تک پہنچنا ممکن نہ تھا چنانچہ انور شیخ نے اپنا کاروبار ترک کر دیا اور ادھیڑ عمر میں پھر سے طالب علم بن گئے۔

- انور شیخ کو بچپن میں پنجابی شاعری کے ساتھ لگاؤ تھا۔ سوہنی مہیوال، سیف الملوک اور محمد بوٹا کی کافیوں کا ان کے مزاج پر اثر ہوا، انہیں اردو شاعری سے رغبت لاہور میں ہوئی جب وہ ۱۹۴۶ء میں وہاں ریلوے کلرک تھے، اگرچہ انہیں عمر بھر شاعری کا شوق رہا اور کبھی کبھی تفریح طبع کے لئے شعر کہہ لیتے تھے لیکن انہوں نے اس بنا پر شاعری کو جزوِ حیات نہ بننے دیا کہ یہ شاعر کو بے عمل بنا دیتی ہے لیکن ۱۹۹۳ء میں شعر گوئی کا غلبہ اس شدت سے بڑھا کہ وہ طوعاً و کرہاً اس کی لپیٹ میں آ گئے، وہ اس میدان میں تلمیذ الرحمٰن ہیں۔ اس لئے انہیں کسی کی شاگردی کا فخر حاصل نہیں، انہوں نے فن شاعری مختلف کتابوں سے اپنی کاوش سے حاصل کیا۔
- شعر و ادب، افسانہ، تنقید نگاری، فلسفہ، مذاہب عالم، تاریخ، قانون، اقتصادیات، عمرانیات اور ٹیکسیشن کا شاید ہی کوئی موضوع ہو جس پر انور شیخ نے قلم نہیں اٹھایا لیکن ان کے افکار کی ترجمان انگریزی زبان ہے جس میں ان کی متعدد کتابیں چھپ کر عالمگیر پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔
- اردو دُنیا میں انور شیخ بحیثیت فلسفی خاصے مشہور و معروف ہیں، انہوں نے اردو افسانہ نگاری کو طنز و مزاح کی آمیزش سے ایک نیا موڑ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔
- ۱۹۵۶ء میں انور شیخ برطانیہ چلے آئے، یہاں آنے کے بعد ان کے ابتدائی تین سال کڑے گزرے لیکن یہاں بھی ان کا تعلیمی سلسلہ جاری رہا اور انسٹی ٹیوٹ آف ٹرانسپورٹ لندن سے گریجویٹ شپ کی ڈگری حاصل کی۔
- حالات انور شیخ کو برطانیہ کے شہر کارڈف لے آئے جہاں وہ چھیالیس برس سے مع اہل و عیال سکونت پذیر ہیں۔ جب انور شیخ کارڈف پہنچے تھے تو ان کی جیب میں صرف پچیس پونڈ تھے، اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری، جلد ہی نوکری تلاش کی

اور پراپرٹی کی خرید وفروخت اور تعمیر کو اپنا کاروبار بنایا اور پچیس سال تک بڑی محنت اور لگن کے ساتھ اپنے کاروبار کو پروان چڑھایا۔

❖ ایک خط میں انور شیخ صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''یوں معلوم ہوتا ہے کہ میری ماں کی دعاؤں اور میرے نانا جان مرحوم کے جذباتِ خیر سگالی نے میری تقدیر از سر نو لکھ دی تھی، شاید یہی وجہ ہے کہ جب میرا کاروبار نقطۂ عروج پر پہنچا اور میری سالانہ آمدنی لاکھوں روپیوں سے بھی تجاوز کر گئی تو اپنے ایام فاقہ کشی کو بھلاتے ہوئے مجھے ہوسِ زر کو ٹھوکر مارنے کی جرأت ہوئی، حیرت یہ ہے کہ میں دقیانوسی نظریۂ تقدیر کا قائل نہیں ہوں پھر بھی اس کا میری عملی زندگی کے ساتھ تعلق ہے۔''

❊❊❊

انور شیخ کا شعری نظریہ

❖ ''شاعری کیا ہے؟ ایک ملکۂ خداداد جس کی تعریف کرنا قیاس آرائی سے زیادہ نہیں، یہ وہ گانٹھ ہے جو کھولنے سے اور گنجلک ہوتی ہے، بایں ہمہ شاعری کی نوعیت وہی ہے جو ایک راز کی ہوتی ہے، جو جتنا گہرا ہو، اُسے جاننے کیلئے دل اُتنا ہی مچلتا ہے۔''

❖ ''شعریت تب پیدا ہوتی ہے جب شاعری کو دل سے جدا کئے بغیر دماغ سے آہنگ کیا جائے، چونکہ شاعری صرف جذبات کی ہی ترجمانی نہیں بلکہ حکمت کی بھی آئینہ دار ہے۔ البتہ حکمت ایک گوہر کمیاب ہے اگر یہ وافر ہو جائے تو حکمت اور حماقت میں فرق باقی نہیں رہتا، یہی وجہ ہے کہ ہر شعر حکیمانہ نہیں ہوسکتا، البتہ یہ کیفیت جذباتی امتزاج کی بالادستی سے پیدا کی جاتی ہے اور اس کی جاذبیت ایسا نکھار بخشتی ہے جو پھولوں کو شبنمی موتیوں کی آراستگی سے حاصل ہوتا ہے۔''

❖ ''رومانی شاعری کی اصل کشش عورت ہے، یہ ایک ایسا موضوع ہے جسے سمجھنے کیلئے حیاتِ خضر بھی کافی نہیں، دانشوروں کو خیال آرائی کرتے ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں لیکن وہ ابھی تک نسوانی معمہ کا حل تلاش نہیں کر سکے، غالباً یہ گہرائی اتھاہ ہے جسے پانا ممکن ہی نہیں ہے وہ اس لئے کہ عورت طبعی نزاکت کا ایک قدرتی مجسمہ ہے، اسکی بقا کا انحصار عملی پیچیدگی پر ہے، جس کا اقرار انکار کا ترجمان ہو جس کی ''نا'' کا مفہوم ''ہاں'' ہو جو نمائش کی خواہاں ہونے کے باوجود اخفاء اور رمز و کنایہ کو اسلوبِ زندگی سمجھتی ہو اور جس کا عشوہ و غمزہ تیر و تفنگ کی حیثیت رکھتا ہو، اسے کوئی کس طرح جان سکتا ہے؟''

❖ ''حسن مجازی ناپائیدار ہے، ایک کلی جب پھول بنتی ہے تو اس کی سندرتا دوبالا ہو جاتی ہے لیکن یہ سندرتا گل شبو سے زیادہ نہیں ہے، جس کی شگفتگی، مہک اور تازگی صرف عارضی ہوتی ہے، انسان جسے کاملیت کی تلاش ہے، حسن حقیقی کے تجسس میں بیتاب

ہو جاتا ہے اور رموزِ مجازی کی تہہ تک پہنچنے کے لئے اس طرح تگ ودَو کرتا ہے جیسے ایک جہاز راں دوربین کے ذریعے دھندلی فضا کا سینہ چیر کر اپنی بینائی کی وسعت کو بڑھانا چاہتا ہے، صوفیاء کا کلام اس حقیقت لازوال کا متلاشی ہے، اس کے لئے ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو رنگ ونور، ناز وقدرت، آہ ونالہ اور عہد وفا سے لبریز ہوتی ہے۔''

❖ ''وہ شاعر ایک ایسا انسان ہے جسے قدرت سیمابی دل بخشتی ہے جو چین کی تلاش میں ہر لحظہ بے قرار رہتا ہے، اسی طرح بے ساختگی اور جذباتی بہاؤ اس کی فطرت کا حصہ بن جاتے ہیں اور اس میں صبر واستقامت کا عنصر کم ہونے لگتا ہے، نہ وہ سیاست داں ہے جو حکمت عملی کو اپنا پیشہ سمجھتا ہے اور نہ ہی وہ سپاہی ہے جو مقابلہ آرائی کو اپنی عظمت خیال کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کا دل اس کے قابو میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے دل کے قابو میں ہوتا ہے جو سیمابی کیفیت کے باعث اپنی دھڑکنوں کی ہم آہنگی کھو بیٹھتا ہے اور اسے سلامتی کا راز، وصالِ یار کے سوا کسی اور چیز میں نظر نہیں آتا۔''

❋❋❋

کچھ مصنف کے بارے میں

نام : ظفر احمد

قلمی نام : عشرت ظفر

پیدائش : ۲۴/اکتوبر ۱۹۴۴ء یو۔پی (انڈیا)

ادبی مشاغل : تنقید، فکشن، شاعری

تصانیف : شعری مجموعے:

نوشہ

ہفت پرکار

اِمشب

سفال

ناول: آخری درویش

زیرِ طبع: تکوین (مضامین)

: فہیم آباد کالونی، فہیم آباد، کانپور، یو۔پی (انڈیا)

Ehtisaab

(Critical and comparative study of Anwar Shaikh's Ghazal)

کس خوبصورتی سے مبصر نے حل کر دیا، دونوں کو اپنی مابہیت، خصلت، مزاج ومنہاج سے باخبر کر دیا۔ اس تکونی کے تمام مصرعے شاعر کی قادرالکلامی اور منطقی سوچ کی غمازی کرتے ہیں اور میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اردو نظم کو جو کس بل حالی کے بعد مسلسل نظم نگار شعرا سے ملتا رہا ہے انور شیخ کی تکونی اس کی توسیع ہے اور یہ وہ فصیل ایوانِ فکر وفن ہے جس پر صرف انہیں کا پرچم اڑ رہا ہے جس کا پھریرا افلاک کی وسعتوں سے مصروف کلام ہے۔

انور شیخ کی ایجاد کردہ دوسری شعری صنف کہمَن ہے یعنی (کہہ، مَن) ''کہہ اے میرے مَن'' انہوں نے اس کی دو قسمیں بتائی ہیں، ایک تو عام کہمَن دوسری تلمیحاتی کہمَن۔ کہمَن کے دو حصے ہیں، ایک (منظر) دوسرا (کہمَن) عام کہمَن میں جو حصہ منظر کہلاتا ہے اس میں شاعر بے ساختہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے جس کہمَن میں بے ساختگی، بیباکی، جذبات کی گہرائی نہ ہو وہ کہمَن کہلانے کے لائق نہیں۔ انہوں نے حصہ اول یعنی ا۔ منظر میں آٹھ مصرعے رکھے ہیں۔ حصہ ثانی یعنی ۲۔ کہمَن میں چار مصرعے رکھے ہیں۔ یہ تو ہوئی عام کہمَن کی تفصیل۔ تلمیحاتی کہمَن ہے تو اسی اصول پر مگر وہ کسی نام یا اہم واقعہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ انور شیخ نے جو کہمَن لکھی ہیں ان میں ملکہ ایلز بیتھ اول، قلوپطرہ، حبیبہ اور سلیمی شاہجہاں کا تحفۂ محبت، حکیم سقراط اور موت خاص ہیں۔ لیکن اس طرح منظر نمبر ا میں آٹھ مصرعے، کہمَن دو میں چار مصرعے لیکن اس کے ساتھ انہوں نے تفصیل بھی رکھی ہے جو نثر میں ہے اور جس کے متعلق یہ تلمیحاتی کہمَن لکھی گئی ہے، اسکے مختصر حالات زندگی اور دیگر تفصیلات درج ہیں گویا ان مصرعوں کو پڑھنے کے بعد تفصیل بھی پڑھی جائے تو منظر زیادہ واضح ہوگا۔ میں یہاں دونوں مثالیں پیش کروں گا۔ تلمیحاتی کہمَن کے منظر سے متعلق انور شیخ کا کہنا ہے کہ منظر کا مطلب منظر کشی سے نہیں بلکہ ایسا حقیقی یا فرضی بیان کردار یا واقعہ مراد ہے جس پر حصہ دوم میں اظہار جذبات کیا جائے۔ یعنی جو حصہ کہمَن ۲ کہلاتا ہے اور صرف دو اشعار یعنی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے، حصہ سوم یعنی تفصیل جو ایک نثر پارہ ہے۔ انور شیخ کہتے ہیں کہ تفصیل سے مراد کوئی واقعہ، بیان قول، روایت یا قصہ ہوسکتا ہے، فرضی بات بھی ہوسکتی ہے مگر اس کا مستند ہونا زیادہ کارآمد ہے۔ اس کا جزو تفصیل شعر ونثر میں ایک پیوند کی حیثیت رکھتا ہے اس کا مطلب مطالعہ کی طرف توجہ دلانا بھی ہے۔ یہ ایک تعمیری صنف سخن ہے۔ پہلے عام کہمَن کی مثال دیکھئے:

تصویرِ یار

(عام کھمَن)

۱۔ منظر

میز پر بیٹھی سدا تکتی ہے تو
بولتی کیونکر نہیں تصویرِ یار

تیری خاموشی تو اک خنجر مجھے
ہر گھڑی رکھتا ہے غم سے اشکبار

انتہائے بدنصیبی ہے یہی
اہلِ دل کو ہو کسی گونگے سے پیار

کچھ تو کہہ اے مہ جبیں گالی ہی دے
تیرا ہذیاں بھی مجھے وجہِ قرار

۲۔ کھمَن

خامشی اصنام کا دستور ہے
سن تو لیتے ہیں یہ کچھ کہتے نہیں

چاہتے ہیں خود ترے دل میں بسیں
اپنے من پر بوجھ وہ سہتے نہیں

〈تلمیحاتی کھمَن〉

قلوپطرہ ۳۰ ق م

۱۔ منظر

قلوپطرہ، قلوپطرہ کا غل ہر سو ہوا پیدا
سفینہ نارسس میں مصر کی ملکہ کا جب آیا

سفینہ مت کہو تھا بقعہ رنگین جنت
کہ ہر گوشہ ہی جس کا حور و غلماں سے ہوا اپنایا

مزین بادباں ہیروں سے چپو تھے ذہیب اس کے
جو مانجھی ناؤ میں ایسے کہ عطر و گل کی اک مایا

فضا موسیقی و نغمہ سے ایسے بن گئی جادو
کہ اینتھونی کا دل بے تابی الفت سے مچکایا

۲۔ کہمَن

نزاکت زن کی مردوں کے لئے اک جاں شکن پھندا
نہ جس سے بچ سکے کوئی یہ وہ عورت کی طاقت ہے

مزے سے سر جھکانا اور ناری کے چرن چھونا
یہ لگتا ہے کہ مردوں کی بڑی سب سے عبادت ہے

۳۔ تفصیل

قلوپطرہ ملکہ مصر کا شمار دنیا کی عظیم ترین خواتین میں ہوتا

ہے۔اس کی وجہ اس کی سیاسی بصیرت یا شاہانہ تمکنت نہیں بلکہ وہ نسوانی نفاست شگفتگی اور دل موہ لینے کی مہارت ہے جو عورت کو قدرت کا سب سے بڑا معمہ اور عجوبہ بنا دیتی ہے اور مرد دنیا کی تمام نعمتوں سے مالا مال ہونے کے باوجود بھی محرومی الفت کے باعث خود کو قلاش، بدنصیب اور نامرد بھی سمجھتا ہے۔

قلوپطرہ کی کشش کا راز اس کے حسن ظاہری میں کم اور جمال باطن میں کہیں زیادہ تھا جس کا تعلق اس کی عادات و اطوار کی شگفتگی، چلن کی جادوگری، طرز گفتگو کی مٹھاس اور ذاتی علم و فضل کی رفعت کے ساتھ تھا، کہتے ہیں کہ اس کی آواز میں ایسی نغمگی تھی جو چنگ و رباب کے تاروں میں ہوتی ہے، یہ نتیجہ تھا اس کی ذاتی تربیت کا اس کے علاوہ اپنے زمانے کی سات زبانیں پوری مہارت کے ساتھ بولتی تھی، اتنا ہی نہیں اسے فن حسن کاری پر عبور حاصل تھا اور مورخ اسے ایک ایسی کتاب کا مصنف قرار دیتے ہیں جو جمال افروزی کے فنون پر سند سمجھی جاتی تھی۔

اس نے اپنے فن دل تراشی کی قوت سے جولیس سیزر جیسے عظیم جرنیل اور فرماں روا کو بندر کی طرح اپنے اشاروں پر اس طرح نچایا کہ وہ قلوپطرہ کو رومن ملکہ بنانے کیلئے جمہوریت کا دشمن بن گیا جو اس کے قتل کا سبب بنا اس کے بعد مارک انتھونی جو کہ ایک مشہور جرنیل اور بہادر سپاہی تھا جب مصر پہونچا تو اسے جولیس سیزر مرحوم سے نفرت و رقابت کا احساس ہونے لگا اس نے قلوپطرہ کو اپنے حضور میں کئی مرتبہ طلب کیا لیکن اس نے انتھونی کے فرمان کو ظاہری طور پر ٹال دیا پھر ایک دن اچانک وہ اپنی جمالیاتی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی اس کا بحری جہاز فن تزئین کا ایک مرقع تھا اس کے بادبان ہیرے موتیوں سے آراستہ تھے اس کے ملاح زیورات سے لدی ہوئی گل

بدن عورتیں تھیں جو عطر و غازہ سے درخشاں اور مہک رہی تھیں۔ جب جہاز ساحل پر پہونچا تو فضا موسیقی و رقص و نغمہ سے گونجنے لگی، انتھونی ادائے حسن کی تاب نہ لا سکا اور قلوپطرہ کا غلام بن گیا۔''

غزالہ انور شیخ کی ایجاد کردہ ایک نئی صنف سخن ہے جسے انہوں نے غزل کے بطن سے ہی برآمد کیا۔ ۱۹۹۹ء میں معرض اظہار میں آنے والی یہ صنف سخن خود میں۔ بے حد مؤثر ہے کیونکہ اس میں عام غزل سے زیادہ آہنگ ہے، موسیقی ہے، خوش سلیقگی ہے اور انہوں نے قدیم مقدس کتب کے مطالعہ کے بعد اس کے پیکر کو ترتیب دیا ہے۔ غزل میں اس طرح کی ایجاد کو قبول کرنا چاہئے جو اس کی غنائیت کو فزوں تر کر سکے، کچھ دنوں پہلے مظہر امام نے جو آزاد غزل ایجاد کی تھی وہ قطعی غیر مؤثر تھی کیونکہ اوزان و بحور ہی کی میزان میں تول کر مصرعے چھوٹے بڑے کر دیئے جاتے ہیں اور غزل کا حسن غائب ہو جاتا ہے۔ انور شیخ نے ایسا نہیں کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ غزل آج اپنے عصری اظہار کے وسیع تر تناظر میں دیکھی جا رہی ہے۔ اب وہ صرف عورتوں سے گفتگو تک محدود نہیں ہے۔ آمیزش شعر و ادب کا جزو بن چکی ہے۔ وہ اصناف سخن کی سالمیت کیلئے حد بندی کو ضروری مانتے ہیں ان کے نزدیک شیر و گیدڑ کے فرق کا مٹ جانا ارتقا نہیں تنزلی کی ایک صورت ہے۔

غزالہ گو، ہر طرح کے موضوعات اس میں شامل کر سکتا ہے گویا یہ محیط ہے تمام افکار پر خواہ وہ باطنی ہوں یا ظاہری، غزالہ کا حسن اس کی ردیف کی تکرار ہے، قافیہ کچھ بھی ہو لیکن ردیف کی تکرار اس کی نغمگی میں اضافہ کرتی ہے، ظاہر ہے کہ ردیف میں حروف یکساں ہوتے ہیں چنانچہ جب انہیں پڑھا جاتا ہے ایک گونج سی پیدا ہوتی ہے۔

غزالہ کا حسن یہ ہے کہ چھ اشعار میں تکرار ردیف ہے، مثلاً آئے بھائے قافیہ، جوانی جوانی ردیف لیکن مقطع میں ردیف مکرر نہیں بلکہ معکوس ہو جاتی ہے یعنی جوانی جوانی کے بجائے کہانی کہانی، نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

غزالہ

تری یاد آئے جوانی جوانی
مرے دل کو بھائے جوانی جوانی

جکڑ لے نہ اپنے شکنجے میں پیری
کوئی گیت گائے جوانی جوانی

بڑھاپے نے افشا کیا راز ہم پر
جو بگڑی بنائے جوانی جوانی

مٹکتے مٹکتے یہ ہو جائے اوجھل
بلائے نہ آئے جوانی جوانی

جو ہو لذت زندگانی کا محرم
سدا گنگنائے جوانی جوانی
ہمیشہ رہی ایک پیری میں حسرت
کبھی لوٹ آئے جوانی جوانی

جوانی کی انور بتاؤں حقیقت
جو دل گدگدائے کہانی کہانی

انور شیخ نے اس طرح کی شعری اصناف ایجاد کر کے فانوس نطق ونوا میں بیشمار چراغ روشن کئے ہیں۔ان کا تخلیقی افق بے حد وسیع وضوفشاں ہے۔علوم مشرق ومغرب پر ان کی نگاہ گہری ہے، تاریخ انسانی اور دیو مالا پر بھی ان کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہے جس کا اظہار ان کے فن پاروں سے ہوتا ہے، باستثنائے چند ان کے معاصر ناقدین نے جو کچھ ان سے متعلق لکھا ہے اس میں یکسانیت در آئی ہے، اردو کلاسک سے ان کے فن کا تقابلی مطالعہ تقریباً نہیں ہے، ہاں جناب ساحر شیوی اور مناظر عاشق ہرگانوی نے اس باب میں کافی کچھ لکھا ہے جسے پڑھا جانا چاہئے۔جس سے انور شیخ کے فن کی گرہیں کھلتی ہیں۔مجھے ڈاکٹر فراز حامدی کے اس نظریے سے اتفاق نہیں ہے کہ انور شیخ فلسفی نہیں ہیں، زندگی خود اپنے آپ میں ایک فلسفہ ہے، اس کا

شارح وہی ہوسکتا ہے جو خود بھی ان تمام گتھیوں کو سلجھانے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ میں نے جو کچھ رشحات قلم انگریزی اور اردو کے حوالے سے دیکھے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ ان کے یہاں فکری سنجیدگی کیا ہے۔ بادی النظر میں شعر سیدھا سادہ لگتا ہے لیکن اس میں معانی کا ایک مواج سمندر انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں کئی بحثیں ہیں جو اس کتاب میں آگے آتی رہیں گی۔ فی الوقت انور شیخ کی ایجاد کردہ صنف سخن غزالہ پر کچھ بات چل رہی ہے جس کے بارے میں خود انہوں نے کہا ہے کہ:

> ''میں نے سوچا تھا کہ راز و نیاز میری آخری شعری پیشکش ہے لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ میں نے غزالہ کو بھی دوام بخشا چونکہ غزالہ کوئی شاعرانہ صنف نہیں جیتی جاگتی حقیقت تھی وہ بذات خود انتہائے مقصود نہیں تھی بلکہ محبوب حقیقی کے وصال کا ذریعہ تھی اس کی آشنائی بھی اس دور میں ہوئی جب کہ میں بھی جوان تھا اور تصوف سے والہانہ عقیدت مجھے محبوب حقیقی کی تلاش میں سرگرم رکھتی تھی اور میری طہارت خلوص و دوستی کی ضامن تھی وہ ایک راہ مجاز تھی جو میرے لئے منزل حقیقت تک پہونچنے کا ذریعہ بنی۔''

انہوں نے اپنے پانچویں شعری مجموعہ ''غزالہ'' کو غزالہ کے نام انتساب کرتے ہوئے جو اشعار کہے ہیں ان سے قطرہ قطرہ تجسس و تلاش کی شراب ٹپکتی ہے اور ساعت دیدار کے باوجود وصل کی آتش شوق موجزن نظر آتی ہے۔ ان اشعار میں اس روحانی فلسفہ کی دمک ہے جو عشق حقیقی کی تلاش پر منتج ہوتا ہے:

اے غزالہ چاندنی راتوں میں دیکھا تھا تجھے
وہ تجلی وہ ضیاپاشی وہ نورانی فضا

زندگانی کا مزا ہر چیز میں تھا موجزن
تیری آنکھوں میں مگر رقصاں تھا اک لطف سوا

اِحتساب

(انور شیخ کی غزل کا تنقیدی و تقابلی مطالعہ)

عشرت ظفر

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ - گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

کس طرح چشم سیہ میں کوندتی تھیں بجلیاں
کیا نظر دراصل وہ تھا ایک اعجاز خدا

ایسے کثرت سے سمٹ آئیں سبھی رنگینیاں
نغمہ وحدت کی پیغمبر تری ہر اک نگہ

اے غزالہ جس پہ تو پل کیلئے بھی مہرباں
گر زمیں ہو تو سمجھتا ہے وہ خود کو آسماں

اے غزالہ صورت و سیرت کی وہ ملکہ تھی تو
جو وفا، طرز حیا میں اصل شانِ کبریا

پیکر اخلاص تصویر سرور جاوداں
عظمت احساس خنداں، رفعت زیب النسا

خانقاہ و مسجد و مندر میں جنت ہے کہاں
گر کوئی جنت تو وہ تیری نگاہوں کی ادا

تو کمال رنگ و بو اشعار کی جلوہ گری
تتلیاں جگنو پتنگے سب کے سب تجھ پر فدا

اے غزالہ تیری آنکھیں چاہتوں کا آسماں
ہر گھڑی میں حسن ربی جس سے ہوتا ہے عیاں

اے غزالہ چومنا تجھ کو ابھی تک یاد ہے
بھول جاؤں کس طرح اے شوکتِ اوجِ دفا

مستی بادہ کے میں احساں اٹھاؤں کس طرح
مجھ کو بہلاتا ہے ہردم تیری یادوں کا نشہ

رات دن میں تیری فرقت میں رہوں آشفتہ سر
زندگی گو تلخ، مثل مے ہے اس کا ذائقہ

انبساط آدمی سے وقت کو ہے دشمنی
لے گیا تجھ کو اچانک اس لئے دست قضا

اے غزالہ تیری آنکھوں کی چمک نبض جہاں
اس سے ہم آہنگ میری دھڑکنوں کے کارواں

اس انتسابیہ نظم میں پندرہ اشعار ہیں۔ جن کے الفاظ کی شریانوں میں شاعر کی آتش شوق تیرتی مچلتی ہوئی نظر آتی ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جس نے غزالہ کو دوام بخشا اور انور شیخ کی فکر ہمہ گیر کو ایک بلند مقام پر فائز کیا۔

متعلقات انور شیخ میں ساحر شیوی یوں رقم طراز ہیں:

''غزالہ صنف غزل کی توسیع ہے مگر قدرے دقیق ہے۔ انور شیخ کے کہنے کے مطابق،، تاکہ اس میں باشعور اور فطری شاعر ہی طبع آزمائی کر سکیں،، غزالہ کا خصوصی موضوع اگرچہ عورت اور حسن و عشق ہی ہے جس میں مکرر ردیف ایک عجیب جذباتی کیفیت، روانی اور زور پیدا کرتی ہے لیکن اسلئے وہ تمام موضوعات بھی موزوں ہیں جنہیں شاعر موثر اور دل آویز طریقے سے نبھانا چاہے۔''

یہ تو صحیح ہے کہ غزالہ غزل کی توسیع ہے۔ایک موثر صنف وجود میں آئی ہے لیکن اس سے مجھے اتفاق نہیں کہ دقیق ہے۔نکتہ سنجی غزل کا طرۂ امتیاز ہے اور یہ نکتہ سنجی انور شیخ کی منظومات ومنثورات دونوں میں ہے اور یہی انہیں ان کے معاصرین میں انہیں منفرد مقام ومرتبہ عطا کرتی ہے۔ میں عامر صدیقی کے اس نظریے سے کسی حد تک اتفاق رکھتا ہوں کہ غزل نما اور آزاد غزل سب وقت کی گرد میں گم ہو چکی ہیں۔اب ان کے طلوع ہونے کا امکان بھی نہیں لیکن غزالہ جس سے غزل کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا ہے زندہ وتابندہ منور ودرخشاں رہے گی لیکن غزالہ سے متعلق سب سے مبسوط رائے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی ہے، مناظر صاحب نو ایجاد اصناف سخن کے مزاج داں ہیں، انہوں نے اس میدان میں بہت کام کیا ہے:

''انور شیخ نے صنف غزل میں توسیع کر کے غزالہ جیسی صنف بھی ایجاد کی ہے ان کی غزالہ میں سیاسی ومعاشرتی مسائل کے ساتھ عورت اور حسن وعشق کے موضوعات ملتے ہیں جس میں بیتابی جذبات ہے، فراق یار کی چیرہ دستیاں ہیں، حالات کے شکوے ہیں، دوستوں کی شکایتیں ہیں، عذاب وثواب ہیں، ساقی ہے، گل وبلبل ہیں، معاشرے پر طنز ہے، مذہبی سیاسی رہنماؤں کی جادوگری بھی ہے، اس صنف میں مکرر آنے کے بجائے معکوس ردیف ہے، دراصل مطلع اور مقطع کی معکوسیت غزالہ کی منزلت کو بلند کرنے کا طریقہ ہے۔انور شیخ کہتے ہیں کہ غزالہ غزل کی بیٹی ہے۔''

کائنات آویزشات وتضادات کا ایک مجموعہ ہے۔شش جہات میں اور اس کے پیچاک میں پھیلی ہوئی زندگی اپنے تحرک میں بیک وقت دیدہ ونادیدہ کیفیات سے نبرد آزما ہے۔انسانی معاشرہ بھی اس کی گرفت میں ہے اور یہی دراصل اس کا حسن ہے، اگر یہ سب کچھ نہ ہو تو اس عظم الشان معاشرہ کا حسن ہی ختم ہو جائے۔انور شیخ نے اس پُر شکوہ دنیا کو شعری پیکروں میں قید کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ ان طائروں کے شہپروں میں برق کی سی جولانی ہے مگر یہ ان کے دام فکر میں پھڑ پھڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس لئے انہوں نے باقاعدہ ایک صنف سخن ''متضاد نظم'' ایجاد کی ہے جو صنعت تضاد کا ایک شاہکار ہے۔

حق وباطل، نور وظلمت، نشاط وغم، رحم وشقاوت اس طرح کی لاکھوں مثالیں ہیں جو

صنعت تضاد کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں اور انور شیخ نے اپنی نظموں میں اس طرح کے موضوعات کو اس طرح برتا ہے کہ سارا حسن سمٹ کر سامنے آ گیا ہے حالانکہ ان کی اس صنف سخن پر قائدین ادب نے تشریح و توضیح کے دریا بہا دیئے ہیں، ہزاروں گلزار کھلا دیئے ہیں لیکن یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر منصور عمر کی رائے بیحد جامع ہے۔ ان کا مضمون ''انور شیخ موضوعاتی تضادات کا شاعر'' مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتب کردہ کتاب ''انور شیخ بحیثیت شاعر'' مطبوعہ ۱۹۹۹ء کے صفحہ ۴۷ر سے ۶۲ر تک محیط ہے، میں ایک طویل اقتباس پیش کرتا ہوں:

''تخلیق کائنات مختلف رنگ و آہنگ زاویہ ہائے خیال ونظر اور مثبت و منفی رویے سے عبارت ہے لہذا کائنات کی ہر شئے میں تضادات کا عکس نمایاں ہے، معاملہ خواہ کائنات ارضی کا ہو یا سماوی کا ہر دو کائنات ہر دو مختلف ومتضاد رجحانات وزاویوں میں تقسیم ہے اور یہ زاویے اور رجحانات مجسم ہوں یا مجرد ان کے دورخ متعین کر دیئے گئے ہیں اور یہی اصول فطرت ہے اور اصول فطرت کبھی نہیں بدلتے، ہم جانتے ہیں کہ خالق کائنات نے کائنات ارضی وسماوی کو حیوانات ونباتات و جمادات سے سجا رکھا ہے، جہاں تک کائنات ارضی کا تعلق ہے تو اسے اللہ نے انسان جو اشرف المخلوق ہے کیلئے مختص کر دیا ہے اور کائنات سماوی بظاہر فرشتوں اور حور وغلماں کی آماجگاہ ہے لیکن یہ بھی دراصل اسی اشرف المخلوقات انسان کی اخروی قیام گاہ ہے جہاں ہر انسان اپنے اپنے اعمال کے مطابق جنت وجہنم میں ٹھکانا پائے گا، گویا ازل تا ابد انسان تضادات کے گھیرے میں رہے گا لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ غیر فطری عمل ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ تضادات اور بوقلمونی کے بغیر انسان کی ذات اور یہ کائنات بے رنگ ہو کر رہ جائیگی۔

عجیب اتفاق ہے کہ انور شیخ کی سماجی وادبی زندگی بھی تضادات سے ہی عبارت رہی ہے، انہوں نے برصغیر کے مشرقی ماحول میں آنکھیں کھولیں اس آب وہوا میں ان کی پرورش وپرداخت ہوئی اور اب یورپ کے مغربی ماحول میں وہ تناور درخت پھل پھول رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں

نے غزلیہ شاعری کے بجائے نظمیہ شاعری کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا، اردو میں نظمیہ شاعری کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ روشنی اور آزاد خیالی کے ماحول میں رہتے ہوئے آزاد نثری نظمیں نہ کہہ کر پابند نظم نگاری کا میدان چنا، اس میدان میں فاتح کی حیثیت سے ادبی دنیا کے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بیسویں صدی میں اقبالؔ، جوشؔ، اختر انصاری کے بعد انورؔ شیخ پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے پابندی کے ساتھ پابند نظمیہ شاعری کو عزت و احترام اور وقار بخشا۔''

بہر حال یہ تو سچ ہے کہ نظمیہ شاعری ایک بہت بڑی کائنات کو خود میں سمیٹتی ہے لیکن غزل بہر حال ایک الگ ہی دنیا ہے جس پر بات بعد میں ہوگی اور تفصیل سے ہوگی اور انورؔ شیخ کی غزل کو ایک نئے انداز میں دیکھنے کی کوشش ہوگی جو میری اس کتاب کا اہم موضوع ہے۔ خود انورؔ شیخ اپنی متضاد نظم کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

''دراصل موضاعاتی تضادات کو کامیابی سے بروئے کار لانا فصاحت کا جزو ہے جس سے مراد خوش بیانی ہے جو الفاظ کو موقع و محل کے مطابق استعمال کرنے سے پیدا ہوتی ہے اس کا تعلق تحریر و تقریر دونوں کے ساتھ ہے۔ صنعت تضاد میں بڑی گہرائی موجود ہے۔ یہ کسی بھی چیز کو اس کے تقابلی انداز میں پیش کر کے اس کی معنویت میں ایک نیا رنگ پیدا کر سکتی ہے مثال کے طور پر کسی چیز کی تصویر اس سے زیادہ خوبصورت جاذب اور واضح نظر آتی ہے یہ نتیجہ ہے تضاد کی کیفیت کا۔ یہ تضاد کہاں سے آ گیا چیز بذات خود ایک حقیقت ہے لیکن اس کی تصویر یا آئینے میں ایک افسانے یا مفروضے کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقت و افسانہ میں تضاد پایا جاتا ہے لہذا تشبیہ و استعارہ سے جو حسن و رنگینی پیدا ہوتی ہے اس میں صنعت تضاد ہی کارفرما ہوتی ہے رخ محبوب کی لذت محض سرخی کے باعث اسے آگ سے مشابہ قرار دینے میں نہیں بلکہ اس تضاد میں بھی ہے جو ٹھنڈے گالوں اور بھڑکتی

ہوئی آگ میں ہے اور جسے شاعر لاشعوری طور پر محسوس کرتا ہے۔''

اس نظم میں ظاہر ہوا کہ پوری کائنات تضادات سے بھری پڑی ہے، نشاط وغم، بہار و خزاں، تقدیر وعمل، شباب وپیری، خیر وشر حالانکہ یہ سب انسانی زندگی کی حقیقتیں ہیں مگر اس طرح ہمارے گرد وپیش بکھری ہوئی ہیں کہ ہم ان کی اہمیت محسوس نہیں کرتے۔ عمر کے دشت بلاخیز میں رات دن پر ہرج مرج کھینچتے ہوئے سفر کرتے رہتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ حقیقتیں ہم سے منہ نہیں موڑتیں خواہ ہم کتنا ہی ان سے اغماض برتیں لیکن ان حقیقتوں کو انور شیخ جیسے شاعر نے شدت سے محسوس کیا۔ میں یہاں مثالاً ان کی نظمیں ''تقدیر'' اور ''عمل'' پیش کروں گا جو ظاہراً تو الگ ہیں لیکن باطناً ایک دوسرے سے مربوط ومنسلک!

تقدیر

(۱)

ہے گلہ تجھ کو ہمیشہ شومئ تقدیر کا
دوستوں کی رنجشوں حالات کی زنجیر کا
کس طرح سہا ہوا ہے اپنے ہی سائے سے تو
یہ جہاں نقشہ ہو جیسے ایزدی تعزیر کا
کھو چکا خوابوں کی دنیا میں تو ایسے رات دن
کیوں خیال آتا نہیں تجھ کو کبھی تعبیر کا
یہ نہ ہو جائے کہیں اور وہ نہ ہو جائے کہیں
گر نہ تو نے حکم مانا کاتبِ تقدیر کا
یہ جہاں تو ناز حسن شوخ کی تصویر ہے
تیرگی کے گوشۂ دل میں نہاں تنویر ہے

(۲)

زندگی جینے کو ہی کہتے ہیں سن اے ہم نشیں
یہ جہاں ہے اک چمن پر تو سمجھتا ہے قفس

زندگی جنبش ہے اک بڑھتا ہوا جوش جنوں
اک مسرت کی تمنا اور جینے کی ہوس
اصل میں تقدیر تو جرأت کا اک انداز ہے
راز شیرینی ہے گرچہ دیکھنے میں ایک خلش
کاروانِ زندگی ہی خود تری تقدیر ہے
آگے بڑھ ہرگز نہ ڈر کہتی ہے یہ ہر دم جرس
کچھ نہیں تقدیر پر تیری پسندیدہ ڈگر
اور جس انداز سے چلتا ہے تو اس راہ پر

عمل

(۱)

عمل نہ ہو تو زندگی ہے اک سرابِ دل لگی
یہ وہ قمر ہے جس میں ہو نہ روشنی نہ مہ وشی
عمل سرور زندگی، عمل ہے نور زندگی
عمل نہیں تو زندگی ہے داستانِ بے کسی
خدا خدا ہے اس لئے کہ وہ عمل کی انتہا
اسے نہ آرزوئے دم نہ خواہش غنودگی
شمیم جاں فزا ہو چاہے دل گداز صاعقہ
سبھی پیمبر عمل رواں دواں ہیں ہر گھڑی
عمل وفا، عمل جفا، عمل حیات کی بنا
عمل نہ ہو تو زندگی ہے اک بجھا ہوا دیا

(۲)

گلہ نہ کر نصیب کا عمل نصیب کی دوا
مرض نہیں جہان میں کہ جس کی ہو نہ یہ شفا

خزاں کی یہ بہار ہے یہ روح کا نکھار ہے
عمل ہے آب زندگی عمل حیات کی ہوا
عمل ہے غمزہ و ادا یہ زندگی کا ہے مزا
عمل بغیر جو جیا اگر جیا تو کیا جیا
عمل کبھی تو آب ہے مگر کبھی بھاپ ہے
یہ برف ہے یہ آگ ہے عمل کہ ہے تری بقا
عمل کی بین پر فدا یہ زندگی کا ناگ ہے
بجائے گر نہ روگ ہے بجائے گر تو راگ ہے

اس طرح کی متضاد نظموں سے انور شیخ کا کلام بھرا پڑا ہے میں نے ان نظموں کو مثالاً اس لئے پیش کیا کہ ان میں شاعر کی زندگی کلام کرتی ہے۔ گفتگو کرتے ہیں وہ لمحے جنہیں عبور کر کے وہ عمر کی اس منزل پر آپہونچا کہ اس کے لہجے میں ایک مربیانہ شکوہ بھی ہے، ایک خطیبانہ جلال بھی ہے، افہام و تفہیم کی تمام تر وادیوں کو طے کرتا ہوا اس کا عمیق و وسیع تجربہ اپنی تلخیوں و شیرینیوں سمیت اس کے فن پاروں میں بولتا ہے جو جمالیات کا ایک جہان بسیط ہے۔

انسانی ذہن کی معراج یہی ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں کی نادیدہ ناشنیدہ جہات کی تلاش میں مسلسل ساعی و کوشاں رہے۔ حالانکہ اس نکتۂ ارتفاع تک پہنچنے والے اذہان کم ہیں لیکن جن کی رسائی وہاں تک ہے وہ تاریخ کے اوراق میں زندہ و جاوید ہیں۔ ایجادات بھی انسانی ذہن کے نکتۂ عروج کا ہی نام ہے اور اس میدان میں انور شیخ کے ذہن زرخیز کی جولانیاں دیکھتے ہی بنتی ہیں چنانچہ انہوں نے جو اصناف سخن ایجاد کیں ان میں ایک منظومہ بھی ہے بیحد انفرادیت اور شکوہ کی غماز۔

ادب میں نئی جہات کی تلاش کے باب میں انور شیخ کے موجد و مفکر ذہن سے متعلق ڈاکٹر امام اعظم کی رائے دلچسپ ہے، ان کا کہنا ہے کہ نئے جہات کی تلاش ضروری ہے اور شاعری کو ایسی سمت عطا کی جائے جس میں دانش ورانہ اور حکیمانہ لہریں اس کی تہوں میں سرایت کر سکیں۔ مزید کہتے ہیں:

"انور شیخ نے شاعری کو نئی زندگی عطا کرنے کیلئے نئی جہتوں

کی تلاش کا عمل جاری کیا، نئی جہتوں کی تلاش ہے شاعری کی فرسودگی، کرتب بازی اور تمام ایسے پہلو جو شاعری کو بے جان بنا رہے ہیں اس کو مدنظر رکھتے ہوئے نئی صنفوں کی طرف توجہ دی۔''

منظومہ انور شیخ کے یہاں کچھ ایسی ہی صنف سخن ہے جو غزل کے بے حد قریب ہے چونکہ انور شیخ کے خیال میں غزل کی کیفیت کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ ''ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی'' چنانچہ انہوں نے غزل کی کوکھ سے ہی منظومہ کو باہر نکالا اور اس صنف کی تفصیل میں تو انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس کے لئے ان کی گراں قدر تصنیف کا بھی مطالعہ ضروری ہے۔ میرے قلم کی سپردگی میں ان تمام اصناف سخن کا اجمالی جائزہ لینا ہے جو انور شیخ کے خلاقانہ ذہن کی ایجاد ہیں چنانچہ انہوں نے منظومہ کی دو اقسام بنائی ہیں (۱) منظومہ اور (۲) تظمینی منظومہ۔ اس ضمن میں انہوں نے بتایا ہے کہ منظومہ کس صنف سخن کو کہتے ہیں، اس کیلئے کیا ضروری ہے اور کیا ضروری نہیں ہے۔ کیا پابندی کیا آزادی ہے۔ اس میں ایک چیز منظومہ نما ہے جو بظاہر تو غزل جیسی ہے لیکن مصاریع میں ایک تشکیل بھی ہے باہمی رشتے بھی ہیں۔ منظومہ اور تظمینی منظومہ میں بہت نازک سا فرق بھی ہے۔ بحور اوزان کی کوئی قید نہیں ہے بس اسی بات کو تفصیل سے کہنا ہے۔ لہجے میں ایک طرح کی چبھن ہے جسے آپ طنز ملیح کا نام دے سکتے ہیں کیونکہ اس میں تمام عصری حسیت سمٹ آتی ہے اس لئے اسے ایک وسیع کینوس پر دیکھا جانا چاہئے۔ منظومہ کی ایک مثال دیکھئے:

اجازت ہو تو کہہ دوں بندہ پرور تمہارا جو کرم مثل ستم ہے
یہی کہتے ہیں اب تو لوگ اکثر تمہارا جو کرم مثل ستم ہے
تمہاری اصل میں جو مہربانی
فقط جور و جفا کی ہے کہانی

ہو رہزن پر لگو جیسے کہ رہبر تمہارا جو کرم مثل ستم ہے
مساوات بشر کے گیت گاؤ
ہمیں دن رات یوں الو بناؤ

حقیقت میں سمجھتے ہو ہمیں خر تمہارا جو کرم مثل ستم ہے
بظاہر تم کو نیکی سے محبت
برائی سے ہمیشہ ہی عداوت

مگر ہو اصل میں اک منبع شر تمہارا جو کرم مثل ستم ہے
لگو جیسے کہ وہ ہو بادِ سحری
منکتی لائے جو سپنے سنہری

جو سچ کہہ دوں تو ہو تم بادِصرصر تمہارا جو کرم مثل ستم ہے
زباں ایسی کہ جیسے ہو ملائی
غضب کی نطق ہے حضرت نے پائی

مگر دل تو مثال سنگ مرمر تمہارا جو کرم مثل ستم ہے
تمہارا قول ہے جیسے کہ گوہر
مگر کردار ہے جیسے کہ اجگر

تعجب کیا جہاں دکھوں کا ہے گھر تمہارا جو کرم مثل ستم ہے
ضرورت ہو تو کندھوں پر بٹھاؤ
نہ ہو تو ہم سے تم سجدے کراؤ

نہ یزداں کا نہ شیطاں کا تمہیں ڈر تمہارا جو کرم مثل ستم ہے
وہ ناداں جو اسے سمجھے کہاوت
محبت کیا ہے یہ خود سے عداوت

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب : احتساب (انور شیخ کی غزل کا تنقیدی و تقابلی مطالعہ)
نام مصنف : عشرت ظفر
پتہ : 105/654، فہیم آباد کالونی، کانپور (یو۔پی)

قیمت : ۲۰۰/- (دوسو روپئے) 7£ (سات پونڈ) 10$ (دس ڈالر)
سن اشاعت : ماہ اگست ۲۰۰۴ء
پبلشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۲
کمپوزنگ : رضوان کمپیوٹر گرافکس، چمن گنج، کانپور

زیرِ اہتمام
پریم گوپال متّل

تقسیم کار
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-110002

ڈراؤ گے ہمیں کیا اے ستم گر تمہارا جو کرم مثلِ ستم ہے

بنائے گر نہ بگڑی کوئی منتر ہے چلتا کام طعنوں سے بھی انور
کہو اس سے بانداز تمسخر تمہارا جو کرم مثلِ ستم ہے

منظومہ کے بطن سے پھوٹا ہوا نخل ثمر دار تضمینی منظومہ بھی ہے جس میں انور شیخ کے تخلیقی مزاج کی بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ بیبا کی، درا کی، شوخی حسن اور جمالیات کا ایک فراواں سمندر ہے جو لفظیات کے پردوں میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے ملاحظہ فرمائیے:

تضمینی منظومہ

خدا ہی جانے زمانے کو اب ہوا ہے کیا نکل رہا ہے دھواں روشنی کے چہرے سے
وفا میں رنگ نہیں ہر کوئی جفا پہ تلا نکل رہا ہے دھواں روشنی کے چہرے سے
کسی کو بھی تو کسی سے نہیں ہے پیار یہاں
جسے بھی دیکھو وہی ہے جہان سے نالاں

یہ زندگی تو بنی جس طرح ہو ایک سزا نکل رہا ہے دھواں روشنی کے چہرے سے
نہیں یہاں ہے کوئی کہہ سکیں جسے اپنا
نفس نفس ہی بنا ہے کہ جیسے اک سپنا

نہ ڈھونڈے سے بھی ملے جس کو ہو خیالِ وفا نکل رہا ہے دھواں روشنی کے چہرے سے
نہ مل سکا ہے کسی کو بھی جس نے جو چاہا
گیا نہ لے کے وہ کچھ ساتھ بھی نہ کچھ لایا

حیات بھی ہے دغا، موت بھی ہے کارِ جفا نکل رہا ہے دھواں روشنی کے چہرے سے
چھپا ہے جو بھی ترے دل میں گر ہو جائے عیاں
وقارِ عشق کا باقی رہے نہ نام ونشاں

مزا وفا میں نہیں، اے مری سرور دغا نکل رہا ہے دھواں روشنی کے چہرے سے
کسی نے کچھ نہ کہا تو نے ہم کو لوٹ لیا
یہ معجزہ ہے تری دوستی کا ماہ لقا

کریں تو کس سے کہو قلب بے نوا کا گلہ نکل رہا ہے دھواں روشنی کے چہرے سے
بلا سے ڈر نہ لگے اب غموں کی شدت سے
بڑھی ہے جرأت کردار اتنی حدت سے

زمانے چاہے تو جتنا بھی اتنا ہم کو ستا نکل رہا ہے دھواں روشنی کے چہرے سے
ضروری ہے کہ وہ کانٹوں سے بھی نباہ کرے
گلوں سے بھی جو مرے یار! دل سے چاہ کرے

کسی سے پھر یہ بتا کس طرح کریں شکوہ نکل رہا ہے دھواں روشنی کے چہرے سے
بجز تضاد کہاں ہے یہ رونق ہستی
غلط ہے وہ جو کہے یہ تو صورتِ پستی

برا نہ مان اگر میں کہوں یہ سب ہی بجا نکل رہا ہے دھواں روشنی کے چہرے سے

انور شیخ کے اس تضمینی منظومہ کا کمال قابل دید ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے مصرعے ''نکل رہا ہے دھواں روشنی کے چہرے سے'' کو لے کر انہوں نے کیا خوبصورت

اور جاں گداز مصرعے لگائے ہیں کس کس طرح دور جدید کی تہذیب کے المیے کو پیش کیا ہے جس میں انسانی نسل گرفتار ہے اور نجات حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ باب مکمل نہیں ہوگا اگر ایک جھلک منظومہ نما کی نہ پیش کی جائے، بہر حال غزل کے فارم میں تخلیق ہونے والا منظومہ نما پیش ہے لیکن اختصار کے ساتھ:

وہ مسکرا کے کہتے ہیں میری طرف نہ دیکھ
آنکھیں ملا کے کہتے ہیں میری طرف نہ دیکھ

یارب یہ حسن کیا ہے عجوبہ کہ اک وہی
گھونگٹ اٹھا کے کہتے ہیں میری طرف نہ دیکھ

ہم دیکھنے کی چیز ہیں ایسا کہا تو تب
انگلی ہلا کے کہتے ہیں میری طرف نہ دیکھ

منظومہ نما کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل کے فارم میں ہونے کے باوجود سارے اشعار ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اٹھا، ہلا، دکھا کے قافیے ہیں۔ ''کے کہتے ہیں میری طرف نہ دیکھ'' ردیف طویل ضرور ہے مگر خوش آہنگ اور بے حد رواں دواں۔ جس طرح شفاف پانی کی موجیں ہموار زمینوں پر پھسلتی چلی جا رہی ہوں اور ان کے لمس سے ہر گوشہ سیراب و شاداب ہو رہا ہو۔

انور شیخ کی ایجادات کی دنیا میں ''محبوبہ'' کا بھی خاص مقام ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک عجیب صنف سخن ہے۔ اس میں شاعر نے بہت سی دوشیزاؤں اور خواتین سے متعلق رومانی و تاثراتی اشعار کہہ کر عشاق کے لئے راہ ہموار کر دی ہے کہ وہ اپنی محبوباؤں سے کس طرح کلام کریں۔ ان میں وہ آئینہ سیمائیں بھی ہیں جن کی آنکھیں کاجل سے بھری ہوئی ہیں وہ محبوبائیں بھی ہیں جن کے گیسو کالے ہیں اور وہ معشوق بھی جن کی زلفوں کے بادل سنہرے اور وہ بھی جن کی آنکھیں نیلی ہیں گویا بقول حافظ شیرازی سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی دونوں ہی جلوہ فگن ہیں۔ ان حسیناؤں کے حسن و جمال، جسم اور حدود جسم کے بیان میں شاعر

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

نے نہایت فیاضی سے کام لیا ہے۔ خوبصورت لفظیات کا ایک موجیں مارتا سمندر ہے۔ اس میں عشق کا گداز بھی ہے حسن کی تب وتاب بھی ہے۔ اگر ایک طرف فرزانہ، ثریا، غزالہ، شبنم ہیں تو دوسری طرف جولیا، ایلینا، ایڈیا، میری پٹریشیا، شیلا بھی ہیں۔ گویا ایک نگارخانہ ہے جس میں وہ آنکھیں بھی ہیں جن کا چہرہ فروغ مے سے گلستاں ہے۔ اور وہ ہونٹ بھی ہیں جو گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح لرز رہے ہیں۔ انور شیخ کہتے ہیں کہ محبوبہ ایک نجی صنف سخن ہے جس میں شاعر اپنے ذاتی حالات کا ذکر کرتا ہے، اسے اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کو فرضی نام سے یاد کرے۔ اگر محبوبہ بیوی ہو تو اس کا اظہار قابل ستائش ہے۔ بیوی کے نام کے فاش ہو جانے سے ڈرنا ناشائستگی اور بدذوقی کی دلیل ہے۔ یہ وہ انداز بیان ہے کہ شاعر اپنے جذبات محبت وتاثرات بذات خود بیان کرتا ہے۔ اس صنف سخن کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اگر شاعر کسی اور کی داستانِ محبت بیان کرتا ہے تو اس صنف کو محبوبہ نما کہتے ہیں۔

محبوبہ انور شیخ کی عجیب وغریب ایجاد ہے۔ پہلے اسے دیکھتے ہیں۔ یہ تین حصوں پر مبنی ہے۔ تعارف، اظہار، حاشیہ۔ اس میں تعارف چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان مصرعوں کے حرف اول اور حرف آخر سے ہی محبوبہ کا نام بنتا ہے۔ اس کی مثال آگے آئے گی اب یہ نام پر منحصر ہے کبھی وہ دو مصرعوں میں پورا ہو جاتا ہے کبھی تین اور کبھی چار مصرعوں میں بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن چار مصرعوں میں ظاہر آٹھ حروف ہوتے ہیں اس لئے ایسا کبھی ہوتا ہے کہ محبوبہ کا نام آٹھ حروف پر مشتمل ہو لیکن اگر ایسا ہو جائے تو اس کی گنجائش موجود ہے۔ اس صنف کے دوسرے حصے کا نام اظہار ہے۔ یہ جزو ثانی ہے جو اس داستان میں عجیب لطف پیدا کرتا ہے۔ بیان کو مؤثر بناتا ہے۔ انور شیخ نے اپنی کتابوں میں تمام تفصیلات پیش کر دی ہیں۔ حاشیہ جو اس صنف سخن کا تیسرا حصہ ہے اس سے متعلق ان کا کہنا ہے کہ یہ محبوبہ سے متعلق ایک قسم کا فٹ نوٹ ہے۔ پوری مشق کو سہل بنانے کے لئے شاعر کو اختیار ہے کہ وہ اسے منظوم رکھے یا منثور۔ اس سلسلے میں انہوں نے دونوں مثالیں دے کر واضح کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ محبوبہ نہ صرف یہ کہ ایک آپ بیتی ہے بلکہ ایک جذباتی داستان ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اگر محبوبہ کسی اور کی کہانی ہو یعنی محبوبہ نما ہو تو حاشیہ کی تمام تفصیلات محبّ کی مہیا کردہ ہوں۔ شاعر کو ایجاد کا حق نہیں۔ بہر حال یہ تو ہے کہ انور شیخ نے صرف نئی اصناف سخن ایجاد ہی نہیں کی

ہیں بلکہ تفصیل سے سب کچھ سمجھا دیا ہے تا کہ یہ مزید آسان ہو جائے۔ اور آنے والی نسلیں اس سے استفادہ و اکتساب کر سکیں۔ وہ اس میدان میں کسی کے مائدۂ فکر و سخن کے ریزہ چیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تمام گوہر آبدار خود ان کے بیکراں بحر افکار سے نمودار ہوئے ہیں اور ان کے اندر بھری ہوئی تخلیقیت کی آگ کا سراغ دیتے ہیں ظاہر ہے کہ شاعری جذبات و مناظر کی تصویر کشی کرتی ہے اور یہ سرمایہ انور شیخ کے یہاں وافر مقدار میں ہے۔ سر دست میں یہاں محبوبہ کی ایک مثال پیش کرتا ہوں جس کا عنوان فرزانہ ہے:

فرزانہ

۱۔ تعارف

فرقت خوباں میں رہتا ہے مرا دل بے قرار
زر سے بڑھ کر ہے کہیں مجھ کو خیال دلربا
نام لینا اس کا ہر دم بن چکی عادت مری
جانتا ہوں چاہئے لینا مجھے نام خدا

۲۔ اظہار

یاد جب آتی ہے فرزانہ تری روتا ہوں میں
کیوں بنادی زندگی میری امنگوں کا مزار
بن گئی دلہن کسی کی ہائے تو بھی آج تک
تیری آمد کا مجھے رہتا ہے ہر دم انتظار
بے وفائی کی بھی حد ہوتی ہے اے زہرہ جبیں
خندہ زن تو دیس میں ہے میں یہاں ہوں اشکبار

۳۔ حاشیہ

''فرزانہ'' ایک فرشتہ سیرت حسینہ تھی۔ اگر چہ وہ ناکامی محبت کی کلی طور پر ذمہ دار نہ تھی۔ میں نے اپنے بیتابی جذبات کے سبب ہمیشہ ہی اسے مورد الزام ٹھہرایا۔ وہ ایک افغانی

لڑکی تھی، میں ان دنوں پشاور میں مقیم تھا اور فارغ اوقات میں ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ ''فرزانہ'' سے بھی اسی سلسلے میں ملاقات ہوئی اور معاملہ رفتہ رفتہ معلمی سے عاشقی میں بدل گیا۔

حالانکہ اس کے باپ کو میرے شادی شدہ ہونے کا علم تھا اس کے باوجود وہ میرے خلاف نہ تھا لیکن جب ایک متمول آدمی نے اس سے فرزانہ کا ہاتھ مانگا تو وہ دولت کی لالچ میں سب کچھ بھول گیا اور ''فرزانہ'' کو بھی وہ وعدے یاد نہ رہے جو اس نے میرے ساتھ کئے تھے۔ جب اس کی اچانک شادی ہوگئی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ غضب یہ ہے کہ مجھے اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہ آیا کیونکہ میں خود شادی شدہ تھا اور اسے عوض میں کچھ دینے کے قابل نہ تھا۔ مرد مرد ہوتے ہیں اور عورتوں کو اپنی دشواریوں کا ذمہ دار ٹھہرانا ایک فطری بات سمجھتے ہیں۔ مجھے اس کی شادی کا سخت صدمہ ہوا اگرچہ میں خود شادی شدہ تھا۔ میں عرصۂ دراز تک اس کے غمِ فراق میں مبتلا رہا۔

یوں تو دیکھیں تو انور شیخ کی ایجاد کردہ یہ صنف سخن انسانی جذبات کا خوبصورت اور شفاف آئینہ ہے جس میں بے کم و کاست تمام تصویریں جلوہ نمائی پر آمادہ نظر آتی ہیں چونکہ حاشیہ میں انہوں نے مضمون کی گنجائش بھی رکھی ہے اس لئے میرے خیال میں تینوں حصے اگر منظوم ہوں تو زیادہ موثر ہوں گے۔

محبوبہ سے ملتی جلتی صنف سخن محبوبہ نما پر بھی انور شیخ نے تفصیل سے لکھا ہے جو انکی تصانیف میں موجود ہے۔ میں نے گذشتہ سطور میں اجمالاً ان پر روشنی بھی ڈالی ہے اس لئے یہاں مثال دینا ضروری نہیں ہے۔

انور شیخ کی ادبی ایجادات وفتوحات میں سے ایک اہم کام کارنامہ مکرولی بھی ہے جس کا جواز قرآن پاک سے بھی پیش کیا گیا ہے جو معاشرتی بدعتوں کیلئے ضرب کاری ثابت ہوسکتی ہے جس کا انداز سہل، اسلوب آسان اور زبان سلیس ہے۔ یہ اہم صنف سخن ہے لیکن قبل اس کے کہ کچھ اس کی تشریح بیان ہو صنف سخن کے موجد کا بیان دیکھئے:

''اس کے ادبی معنوں کو سمجھنے کیلئے مکر چاندنی کا تصور کیجئے جو پچھلی رات کی دھندلی سی چاندنی کو کہتے ہیں اور صبح ہونے کا دھوکا دیتی ہے۔ یہ صبح کاذب کے نام سے مشہور ہے لیکن حقیقتاً صحیح نہیں ہے۔ مکرولی دراصل ایک پنجابی لفظ ہے جو بظاہر مکر سے ماخوذ ہے۔ یہ

شرارت کے معنوں میں مستعمل ہے لیکن ایسی شرارت جو ہوتو پر پیچ لیکن بظاہر دل لگی معلوم ہو لہذا مکرولی کے موضوعات وہ ہیں جن کا تعلق فتنہ وفساد، دجل وشرارت، طنز سماجی سیاسی رومانی ہیرا پھیری سے ہے لیکن مکرولی کا مدعا ان فاسدانہ موضوعات کی ترویج نہیں بلکہ بدی کو اس رنگ میں پیش کرنا مقصود ہے کہ اس کا محاسبہ کیا جا سکے۔

مکرولی وہ صنف سخن ہے جس کا مقصد معاشرے سے مکروفریب کی ملمع کاریوں کو دور کرنا ہے اس لئے اس میں وہ تمام عنوانات شامل ہیں جن کا تعلق ظاہریت طنز وتنقید، مکرو فریب اور احتجاج سے ہو اس لئے یہ صنف حمد ونعت اور ستائش کیلئے موزوں نہیں ہے۔ چونکہ اسلام نے معاشرے کی اصلاح پر زور دیا ہے اسلئے اس صنف کو اپنانا کار خیر یا عبادت سے کم نہیں۔ ہیئتی اعتبار سے مکرولی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ (۱) خطاب (۲) سائل (۳) نکتہ داں۔

خطاب :- وہ حصہ جس میں کوئی واقعہ یا روایت بیان ہوتی ہے۔ یہ اصل پس منظر ہوتا ہے جس کا تعلق ریاکاری سے بظاہر شیریں بباطن تلخ اور مضرت رساں۔

سائل :- وہ حصہ جو اس پر حیرت کا اظہار کرتا ہے جس میں ایک طرح کی لاعلمی پوشیدہ ہوتی ہے لیکن یہی سوال یا حیرت عقدہ کشائی کی مظہر بھی ہے۔

نکتہ داں :- مکرولی کا وہ کردار ہے جسے ''مرد دانا'' کہنا بہتر ہے۔ وہ اس میں پیش کردہ الجھنیں اپنے ڈھنگ سے سلجھاتا ہے اور یہ فریضہ اکثر سائل سے مخاطب ہو کر ادا کرتا ہے۔ کبھی براہ راست بھی ادا کرتا ہے۔

> ''مکرولی میں بحر کی قید نہیں ہے۔ اس کا انتخاب شاعر پر منحصر ہے۔ مصرعوں کی بھی قید نہیں ہے۔ جتنے مصرعوں میں اپنا مافی الضمیر یا مدعا بیان کر دیا جائے لیکن زیادہ تر خطاب میں چھ مصرعے، سائل میں دو مصرعے اور نکتہ داں میں چار مصرعے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ بات تفصیل سے بیان کی جائے۔''

میرے خیال میں مکرولی ایک عجیب صنف سخن ہے کیونکہ ہمارے معاشرے میں لوگ زیادہ تر اپنے افعال واعمال کی پردہ پوشی کرتے ہیں، اپنے فرائض اور حقائق سے اغماض برتتے ہیں لیکن مکرولی دبیز نقابوں سے باہر کھینچ کر لاتی ہے ان چہروں کو جن پر ریاکاری کا غازہ

ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

مگر مچھ کے آنسو

خطاب

نامہ بر نے رابعہ کو جو خبر دی تھی بری
اس کا خاوند ہوگیا ہے کار کی زد کا شکار

ایک بھی آنسو نہ نکلا اس کی چشم ناز سے
دیکھ کر لوگوں کو یکدم بن گئی سجدہ گزار

وہ لگی کہنے نہیں شکوہ مجھے تجھ سے خدا
جو بھی ہو تیری رضا اس پر دل و جاں سے نثار

سائل:

کوئی بتلاؤ یہ بیوی یا کوئی جنت کی حور
جس کو ہے مرغوب ہر دم مرضیٔ پروردگار

نکتہ داں:

یہ نہیں ہے حور جنت یہ جہنم کی بلا
اس کے دل میں گونجتے ہیں ہر گھڑی نغمات یار
اصل میں خوش ہے کہ خاوند سے ملی چھٹی اسے
گو بظاہر ہے اداسی سے عیاں شوہر کا پیار

مناسب نہ ہوگا اگر میں یہاں اس نومولود لیکن حیرت انگیز صنف سخن سے متعلق ایک اور صنف سخن مکرولچہ کا ذکر نہ کروں۔ وہ بھی اپنے آپ میں خوب ہے اور انور شیخ کے تخلیقی ذہن کا ایک حیرت انگیز کارنامہ۔ اسے اگست ۲۰۰۳ء میں ایجاد کیا گیا۔

انور شیخ فرماتے ہیں:

''مکرولچہ دراصل مکرولی کی ڈرامائی پیش کش ہے اور یہ تمثیلچہ سے بہت مشابہہ ہے ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تمثیلچہ کی بنا کوئی بھی مضمون ہوسکتا ہے لیکن مکرولچہ کے بنا مکرولی کی طرح مکروفریب ہی ہے۔ جس کی بنیاد مکروفریب پر نہ ہو اسے مکرولچہ نہیں کہہ سکتے۔

ان دونوں میں کچھ ہیئتی فرق بھی ہے کہ سائل اور نکتہ داں کے علاوہ مکرولچے میں اور بھی کردار ہوسکتے ہیں اس میں تمثیلچے کی مشابہت کے سبب خطاب کی جگہ منظر نے لے لی ہے۔ منظر منظوم اور منثور دونوں طرح جائز ہے اس طرح شاعر کو اختیار ہے کہ وہ سائل اور نکتہ داں کو چاہے تو مکرولچہ کے وسط میں شروع میں یا آخر میں جگہ دے۔ اس صنف کے پیش نظر ایسی لچک بہت ضروری ہے۔''

جناب انور شیخ کا یہ بھی کہنا ہے کہ لفظ مکرولچہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے ذہن کی پیداوار ہے۔ مکرولی کے موضوع پر بات چیت کے دوران انہوں نے کہا تھا کہ مکرولی کے ہمرکاب مکرولچہ بھی ہو اس طرح مجھے مکرولچہ کے اجزائے ترکیبی کی تحریک ہوئی ہے۔

بہرحال یہ سب تو ہے لیکن انور شیخ کا مکرولچہ اپنے آپ میں موضوع کا ایک جہان بسیط سمیٹتا ہے۔ بات جس حوالے سے ہوتی ہے کردار اسی پیرہن میں آتے ہیں۔ کہیں سے کوئی کمی نہیں رہ جاتی۔ ان کے دو مکرولچے بیحد اہمیت کے حامل ہیں۔ اورنگ زیب اور اکبر، رحمان شیطان اور انسان۔ ظاہر ہے ان دونوں موضوعات میں ایک بسیط منظر پوشیدہ ہے مگر میں یہاں مثال میں اول الذکر کو پیش کر رہا ہوں:

انتساب

جدید غزل کے شہسوار

غلام مرتضیٰ راہی

کے نام

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگرم ، انجمنے ساختہ اند
(بابا فغانی)

اورنگ زیب اور اکبر

منظر

مغلیہ لشکر مارواڑ فتح کرنے کیلئے آگے بڑھ رہا ہے۔ لیکن اس کا کمسن راجہ اجیت سنگھ ابھی جنگجوئی کے قابل نہیں۔ اس کی ریاست پر قبضہ جمانے کیلئے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اجمیر میں ہیڈکوارٹر قائم کرلیا ہے۔ مغلیہ فوج اس کے جواں سال بیٹے اکبر کی کمانڈ میں گاؤں جلا رہی ہے اور مندروں کو مسمار کر رہی ہے۔ مارواڑ میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ اجیت سنگھ کی ماں جو میواڑ کی شہزادی ہے، مجلس عاملہ کے سردار اجیت سنگھ سے یوں خطاب کرتی ہے:

رانی:

راجپوتانہ وہ دھرتی جس کا ہے اونچا سماج
ہے یہاں شمشیر ہی ہر روگ کا موزوں علاج

راجپوتی کا تقاضہ ہے کہ ہم کٹ جائیں آج
کچھ بھی ہو لیکن گنوا سکتے نہیں ہیں اپنا راج

خوں خرابے پر فدا جو بھیڑیا، اورنگ زیب
ہم بھی وہ ہیں جن کا زیور، جرأت و صبر و شکیب

ناریاں ہم جو جلائیں شوق سے اپنی چتا
مرد اپنا تو وہی ہے آن پر جو مٹ سکا

راجپوتوں کی یہ فطرت خوں سے ہولی کھیلنا
اپنی عظمت کے لئے ہر دکھ خوشی سے جھیلنا

دیکھتے کیا ہو، اٹھو۔ اب سر پہ سب باندھو کفن
اب تقاضا کر رہی ہے تم سے خود شانِ وطن

راج سنگھ:

راجپوت ہم بھی سبھی تیری طرح ہیں۔ اے بہن
راجپوتی اصل میں ہے سر کٹا دینے کا فن

سرفروشی۔ درحقیقت ہے کمالِ آبرو
مرنا چوہوں کی طرح ہرگز نہ اچھی آرزو

ہم نہتے۔ مغل ہتھیاروں سے ہیں آراستہ
یہ غلط چڑیا بنے۔ شاہیں کا گر خود ناشتہ

رانی (چلاّ کر):

راجپوتی مت کہو اس کو ارے! یہ ہے فریب
شیر کے پنجے میں کب تلوار دے سکتی ہے زیب؟

میرا بیٹا تو ہے کمسن، اک یتیمِ بے نوا
کر سکے ہرگز نہ کچھ۔ ہائے وہ رونے کے سوا

راجپوتوں کا تو صدیوں سے یہی دستور ہے
اُس پہ مر مٹتے ہیں جو بھی بندۂ مجبور ہے

راجپوتوں سے ہے ڈرتی موت۔ وہ ڈرتے نہیں
کچھ بھی ہو وہ بزدلی کے کام تو کرتے نہیں

پہن لو یہ چوڑیاں تم موت سے ڈرتے ہو گر
کیا ہوا جو عورتیں ہیں۔ ہوں گی سب سینہ سپر

راج سنگھ (گرج کر):

چوڑیاں جو پہن لے، رہتا نہیں وہ راجپوت
جس کو ہے شمشیر، زیور۔ وہ تو ہے ایسا سپوت

کٹ مریں گے آن کی خاطر۔ ہمارا ہے بچن
مرد کی سب سے بڑی عزت جو وہ خونیں کفن

منظر

محفل میں نعرہ بازی سے فضا گونجنے لگتی ہے۔ ہر ایک مرنے مارنے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ اس غوغہ آرائی میں درگا داس کی آواز ابھرتی ہے۔ اور وہ اہل مجلس سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

سلطنت یارو! نہیں ملتی فقط شمشیر سے
عین ممکن وا ہو عقدہ ناخنِ تدبیر سے

باپ بیٹے کو لڑا دے ۔ یہ تو ایسی بات ہے
یہ جنوں ایسا سمجھتا ہے جو اِن کو رات ہے

درحقیقت ۔ مغل شہزادوں کی یہ رسمِ کہن
باپ سے کرنا بغاوت راج نیتی کا ہے فن

شاہ جہاں کے واسطے ۔ ناسور تھا اورنگ زیب
کیوں نہیں جائز ۔ اگر اکبر بھی دے اس کا فریب

بزدلی کا دوستو! مجھ پر نہ کرنا تم گماں
میں سپاہی ۔ جو سیاست کے ہنر کا راز داں

اہل مجلس (چلاّ کر):

واہ وا ! کیا بات اے راٹھور ! جو تو نے کہی
یہ وہ حکمت ہے جسے لبیک کہتے ہیں سبھی

منظر

اکبر راجپوتوں کے جھانسے میں آ کر یکم جنوری ۱۶۸۱ء کو اورنگ زیب سے اقتدار چھیننے کے لئے علم بغاوت بلند کر دیتا ہے ۔ چار حواری ملاّ اورنگ زیب کو شریعت محمدی کا دشمن قرار دیتے ہوئے اس کے فاسق ہونے کا اعلان کرتے ہیں ۔ اکبر کو شہنشاہ ہند تسلیم کیا جاتا ہے اور وہ اپنے باپ کے خلاف اجمیر کی طرف بڑھتا ہے ۔ اکبر کی کمانڈ میں ستر ہزار سپاہی ہیں لیکن اورنگ زیب کے پاس برائے نام فوج ہے ۔ اس کے وفادار عسکری دستے اس سے کہیں دور ہیں ۔ یہ سب کچھ اچانک ہوا اسلئے اورنگ زیب اس کیلئے تیار نہیں، اس کے درباریوں میں

چہ مگوئیاں ہوتی ہیں:

ایک مشیر (اورنگ زیب سے یوں مخاطب ہوتا ہے):

آپ کا دشمن تو اے آقا! ہے اک جم غفیر
اور اکبر جنگجوئی میں بھی اک مرد بصیر

کیا نہیں بہتر کہ ہم ہوں شب کے پردے میں فرار
وقت موزوں پر دکھائیں اس کو تیغ آبدار

دوسرا مشیر (مؤدبانہ طور پر):

مشورہ اچھا ہے آقا! بات اس کی مانئے
اس میں جو حکمت ہے اس کو غور سے پہچانئے

اورنگ زیب (متانت سے مسکرا کر):

احمقو! سوچا کبھی تم نے میں عالمگیر ہوں
سینۂ فولاد سے جو پارہ ہو وہ تیر ہوں

قوت دشمن۔ مجھے ہرگز ڈرا سکتی نہیں
ہوں نہتہ بھی اگر تو صاحب شمشیر ہوں

مجھ کو قسمت کے فسانے کب ہراساں کر سکیں
کب ڈرائے موت مجھ کو۔ اپنی خود تقدیر ہوں

ہے تدبر میں چھپا۔نوکِ سناں میں ہے کہاں
جس پہ ہو نصرت خدا۔وہ صاحب تدبیر ہوں

معمولی وقفے کے بعد.....

میرا خط پہنچاؤ اکبر تک ۔ابھی اے ہمرہو !
جاؤ مانند ہوا۔ ہرگز نہ تم غفلت کرو

اس کو یہ نامہ دو جب کہ ہر کوئی ہو دیکھتا
راجپوتوں پر ہو۔ تا کہ اس کا جادو۔ برملا

منظر

رات کا وقت ہے۔شاہی قاصد خط لے کر اکبر کے خیمے کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ خط درگا داس کے ہاتھ لگتا ہے۔ جسے اعلانیہ پڑھا جاتا ہے۔اس میں مرقوم ہے:

اورنگ زیب :

واہ وا ! بیٹے کروں کیا تیری حکمت کی ثنا
راجپوتوں کو غضب کا تو نے ہے جھانسہ دیا

وہ سمجھتے ہیں کہ تو نے چھینا مجھ سے اقتدار
ان کو کیا معلوم اکبر، تجھ کو جو بابا سے پیار

وہ نہ جانے راج نیتی اک سنہری جال ہے
راجپوت اس سلسلے میں ایک ننھا بال ہے

عقب میں رکھنا انہیں کل گرم ہو جب کارزار
آگے سے تم اور پیچھے سے کروں گا ان پہ وار

راجپوتوں پہ نہ ہونے دینا تم یہ راز وا
میں مٹادوں گا انہیں کل جانتا ہے یہ خدا

منظر

اس خط کو سن کر راجپوتوں میں افراتفری مچنے لگتی ہے۔ وہ اکبر سے بدظن ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اورنگ زیب لڑائی کے بغیر ہی میدان جیت لیتا ہے اور اکبر کو فرار ہونا پڑتا ہے۔

سائل:

سب کہیں تھا عابد وصالح بڑا اورنگ زیب
کس طرح ممکن روا ہو۔ اس کو یہ مکر وفریب

نکتہ داں:

یہ سیاست ہے جسے کہتے ہو تم مکر وفریب
یہ نہیں ممکن بنے، اس بن کوئی اورنگ زیب

جنگ ہو یا پیار۔ اس میں کچھ نہیں ہے ناروا
ہو ضروری ۔آدمی سے مکر کرتا ہے خدا

مکرولی اور مکرولچہ کا اجمالاً ذکر ختم ہوا۔ حالانکہ انور شیخ کی ایجاد کردہ یہ اصناف سخن اپنے آپ میں ایسے وسیع و بسیط مناظر رکھتی ہیں جن پر ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ لیکن میں کچھ تفصیل سے یہاں اس نو ایجاد صنف سخن کا ذکر کرنا چاہوں گا جو انہوں نے سال گذشتہ مئی ۲۰۰۳ء میں ایجاد کی ہے جس کا نام تلخی ہے۔ وہ خود میں بیحد اہمیت کی حامل ہے۔ انور شیخ نے اس صنف سخن کا تعارف اپنے تازہ شعری مجموعے ''شرارِ دل'' مطبوعہ ۲۰۰۴ء میں پیش کیا ہے لیکن میں اس تمام تفصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے جو انہوں نے ظفر عمر قدوائی، فراز حامدی، مناظر عاشق ہرگانوی، اکبر حیدرآبادی، ف۔س۔ اعجاز، طاہر شیوی سے متعلق پیش کی ہیں، بات کرتا ہوں۔ جس میں ان ارباب ادب کے تئیں انور شیخ کا حسن نظر کارفرما ہے۔ تلخی جیسی اہم صنف سخن کے لئے خود موجد کا یہ خیال ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ زندگی تضادات کا مجموعہ ہے جس طرح تاریکی کے بغیر روشنی کا تصور ممکن نہیں اسی طرح تلخی کے بغیر مسرت یا خوشی بے معنی ہیں لہذا حقیقت میں مسرور وہی ہے جو تلخی سے بھی آگاہ ہو۔ اگرچہ انسان مسرتوں کا دلدادہ ہے لیکن ان کا حصول تلخیوں کی راہ سے گزر کر ہی ممکن ہے جس شخص نے تلخیوں کا کبھی سامنا نہ کیا ہو وہ راحتوں کی منزلت کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔''

تلخی سے مراد آبیل مجھ کو مار نہیں ہے یعنی زندگی خود اتنی تلخ ہے کہ انسان کو خود تلخیاں پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے لئے آسائش چاہتا ہے۔ ایک تلخی ملاحظہ ہو:

شیرینی اور تلخی

شاکی (شرینی):

زندگی شیریں تھی لیکن تو نے اے تلخی بتا
حسرتوں سے کیوں اسے کڑوا دیا اتنا بتا

ملزم (تلخی):

تو بڑی ناداں ہے شیرینی نہیں یہ جانتی
تلخیاں شعلہ وہ جس پر زندگانی کی بنا
گرچہ ہے آتش جلاتی ہاں مگر سچ تو یہی
ہے اسی کے دم سے وابستہ زمانے کی بقا

''ہیئتی وفنی اعتبار سے اسے میں نے سادہ اور سہل بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہر تلخی ایک شعر ایک قطعہ کا مجموعہ ہے اس میں بحر کی قید نہیں۔ ہر تلخی ایک مکالمے کی صورت میں ہے اس کے دو اجزا ہیں۔ شاکی اور ملزم۔ شاکی تلخی کو ایک شعر میں بیان کرتا ہے۔ ملزم اس کا جواب قطعے کی صورت میں دیتا ہے اور یہ جواب حقیقت دوغلہ پن طنز وغیرہ کی صورت میں ہوسکتا ہے۔

تلخی وہ صنف سخن ہے جس کا مقصد شکایت احتجاج منادی و تگ ودو کے ذریعہ حصول مسرت ہے۔ مسرت بذات خود ایک فلسفیانہ اور طویل موضوع ہے۔ تلخی ایک عملی صنف سخن ہے۔ اور مشرقی معاشروں کے لئے بیحد اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ کوئی موضوع زندگی اس کے

دائرہ اختیار سے باہر نہیں۔ رومانیت، سیاست، معیشت، سماج، پیار، دشمنی، جفا عمل تقدیر سب اس میں شامل ہیں۔''

مجھے انور شیخ کی تحریر کا تفصیل سے حوالہ اس لئے دینا پڑا کہ تلخی کے تمام خدوخال واضح ہو جائیں اور کوہسار زندگی کے قلب میں سوئے ہوئے اصنام کروٹیں لینے لگیں۔ قارئین ادب پر یہ راز فاش ہو کہ کس طرح زندگی کی اس بساط پر جذبات کے درمیان، اشیاء کے درمیان، انسانوں کے درمیان، ان کے گرد محیط رشتوں کے درمیان ایک مکالمہ جاری رہتا ہے۔ حکایات کا سلسلہ بھی رہتا ہے جوابات کا بھی۔ ظاہر ہے کہ عدم اطمینان یا اطمینان یہ ساری چیزیں اہمیت کی حامل ہیں اور اس صنف سخن میں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ایجاد انسانی زندگی کے بیشتر گوشوں کو واشگاف کرتی ہے اور ہر لمحہ اس سے ثروت مند اور متمتع ہوتا ہے۔ انور شیخ نے اس ضمن میں ہزاروں موضوعات لئے ہیں لیکن جیسا کہ ان کا مزاج تخلیقیت ہے تمام اصناف سخن میں بیبا کی شوخی طنز و مزاح، وہ اس صنف میں بھی ہے۔ ان موضوعات پر انہوں نے اپنے دوستوں، فراز حامدی، غلام مرتضےٰ راہی، ساحر شیوی، مناظر عاشق ہرگانوی، ظفر عمر قدوائی کو بھی سمیٹا ہے۔ دلچسپ تلخیاں لکھی ہیں۔ یہاں میں ان کی ایک تلخی جو بیگم راہی اور غلام مرتضےٰ راہی سے متعلق ہے پیش کرتا ہوں۔ غلام مرتضےٰ میرے دوست ہیں ان کی زندگی کا اہم المیہ صاحب اولاد نہ ہونا ہے اس کا احساس اب انہیں اور ان کی بیگم کو شدید ہے کیونکہ زندگی کی شام ڈھل رہی ہے۔ اس سلسلے میں راہی صاحب نے کبھی یہ شعر بھی کہا تھا ۔

ماں باپ کے رتبے کو کبھی پہونچے نہیں ہم
قدموں میں ہمارے کبھی جنت نہیں آئی

ظاہر ہے کہ اس شعر میں بیحد حسرت و افسردگی کی آتش سیال رواں ہے۔ لیکن انور شیخ نے غلام مرتضےٰ راہی اور ان کی بیگم کے اس کرب انگیز المیے کو کس انداز سے تلخی کے پیکر میں ڈھالا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

فہرست مضامین

۱۔ صریرِ قلم نغمۂ سروش (دیباچہ) 9

۲۔ انور شیخ کی غزل کا لفظی اور لسانی نظام 71

۳۔ انور شیخ کی غزل میں رومانیت و ارضیت 91

۴۔ انور شیخ کی غزل میں علامت و استعارہ 105

۵۔ انور شیخ کی غزل میں حواسی پیکروں کا طلسم 119

۶۔ انور شیخ کی غزل میں صنف نازک کی سحر انگیزی 133

۷۔ انور شیخ کی غزل میں ادراکِ جمال 153

۸۔ انور شیخ کی غزل کا کلاسک سے رشتہ 171

۹۔ انور شیخ کی غزل میں عصری شعور کی گونج 187

۱۰۔ انور شیخ کی غزل میں طنز و مزاح 201

- انور شیخ ایک نظر میں 215
- انور شیخ کا شعری نظریہ 223

***

شاکی (بیگم):

میرے قدموں میں نہیں جنت کہ بے اولاد ہوں
مجھ کو ہمدم یہ بتا آخر ہے میری کیا خطا؟

ملزم (غلام مرتضےٰ راہی):

آؤ مت پچھتائیں اس پر جو نہیں ہم کو ملا
شکر یہ اس کا کریں قدرت نے جو ہم کو دیا
اس سے بڑھ کر کیا کرم رب جہاں کا جان من
روز اول سے مری تو اور میں تجھ پر فدا

اس سے پہلے کہ میں اس کتاب کے اصل موضوع انور شیخ کی غزل کے گوناگوں پہلوؤں پر کلام شروع کروں یہ غیر منصفانہ ہوگا کہ میں اجمالی ہی طور پر سہی لیکن انور شیخ کے یہاں مکالمہ تمثیلچہ (ڈرامچہ) اور فکشن کی رنگارنگی کی بات نہ کروں۔ ظاہر ہے کہ ایک ہمہ جہت متنوع ذہن رکھنے والے تخلیق کار کے تمام فن پاروں کا جائزہ ہی اس کی شخصیت کو مکمل کر سکتا ہے۔ یہ وہ خصوصی اصناف سخن ہیں جنہیں انور شیخ کی فکر جہاں تاب نے وسعت دی ہے۔ مکالمہ دو چیزوں کے درمیان بات چیت ہو خواہ وہ متشکل ہو یا نادیدگی کی منزل میں ہو مگر اپنا بھرپور وجود رکھتی ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ دونوں حصوں میں آٹھ آٹھ مصرعے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر فولاد اور ریشم کے درمیان مکالمہ دیکھئے:

فولاد اور ریشم

(۱)

فولاد (ریشم سے):

میں وجاہت قوت عالم نشان برتری
میں ہی شکتی جوش ہستی بیکسوں کا دستگیر

میں بنائے شان و شوکت سلطنت بام ظفر
وہ نہ جانے ننگ پستی جس کا بن جاؤں ظہیر
نور و ظلمت کی حکومت میرے دم پر منحصر
ہوں فریب دلکشی دام نزاکت اے حریر
زندگی کیا ایک ٹکر ایک جھگڑ اک بھنور
تابع فولاد ہے دنیا کا سب ہی خیر و شر

ریشم (فولاد سے):

تو نے اے فولاد جو کچھ بھی کہا وہ ٹھیک ہے
بھول مت ریشم سے وابستہ ہے انسانی ضمیر
مسئلہ ہر ایک حل ہوتا ہے تب شمشیر سے
قوت اخلاق آدم کی بڑی سے سب سے مشیر
روگ وہ جس کی شفا ممکن نہ ہو فولاد سے
دلفریبی نازکی اس کا علاج بے نظیر
دیکھنے میں گو نزاکت پر بلا کا دام ہوں
میں ہوں وہ پھندہ کبھی راون کبھی تو رام ہوں

اس طرح چوہا اور بلی، حسرت اور تمنا، حقیقت اور افسانہ، دانش اور جہل، انسان اور بندران تمام موضوعات پر انور شیخ نے مکالمے کے ذریعہ اظہار خیال کیا ہے کیونکہ یہ تمام چیزیں انسانی زندگی سے کسی نہ کسی طور پر ہم رشتہ ہیں۔ ان میں تمثیلچہ یا ڈرامچہ قدرے طویل ہے لیکن اپنی مثال آپ ہے۔ میں یہاں نمونتاً ان کا تمثیلچہ سیاست داں پیش کر رہا ہوں جو بارہ حصوں پر مشتمل ہے مگر بے حد دلچسپ اور معنی خیز:

سیاست داں

منظر :شیطان کے دربار میں شیطان کے چیلے حاضر ہیں۔ وہ سب افسردہ نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب انسان کا اخلاقی ارتقا ہے۔ وہ سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ اچانک مہاچیلا اٹھ کر شیطان سے فریاد کرتا ہے۔

(۱) مہاچیلا (شیطان سے)

اجازت ہو اگر اے شاہ تاریکی! تو میں کہہ دوں
لرزنے کو ہے اب تیرا بھی اندازِ جہاں بانی
ترے چیلوں کی پسپائی سے ڈرتا ہوں مرے آقا
نہ اب روشن ضمیری سے گرے یہ قصرِ شیطانی
ترانے گا رہے سب لوگ ہی ذوقِ صداقت کے
بہت ممکن کہ اب جمہور کی قایم ہو سلطانی
اگر ایسا ہوا تو اہل دنیا کا بھلا ہوگا
مگر شاہ سیاہی! تیرے بندوں کا برا ہوگا

(۲)

نہ کمزوروں کو کوٹیں گے نہ بیواؤں کو لوٹیں گے
کوئی ترسے گا روٹی کو، نہ ہوگا لادوا کوئی
ملے گا لوگ جو چاہیں نہ ہوں گی غم زدہ آہیں
کریں گے ناز الفت پر نہ ہوگا بے وفا کوئی
کہ ہوگا تیغ کا سر خم صریر خامہ اک سرگم
نہیں ممکن رہے دنیا میں پھر رسم جفا کوئی

زمانے کو ضرورت کیا شہ ظلمت! سچائی کی ؟
اسے حاجت ہے روباہی ، دہائی ، روسیاہی کی

(۳)

ہے آدم مظہر یزداں ، مگر اب صورت حیواں
یہ پھر بن جائیگا انساں نہ جانے گر ہے کیا ظلمت
جسے ناداں کہیں روشن ضمیری لعنتِ دنیا
حقیقت میں جہالت ہے زمانے کی بڑی لذت
جسے پاگل کہیں روشن ضمیری اک فسانہ ہے
یہ ویرانہ ہے وہ جو یاس وحسرت کا ٹھکانہ ہے

(۴)

غضب ہے شاہِ ظلمت اب یہاں روشن ضمیری سے
بہت ممکن کہ جو چشمۂ شر، وہ ٹوٹ جائے گا
نہ مُلّا اور پنڈت ورغلائیں گے زمانے کو
جہاں ان کی سیہ کاری سے بالکل چھوٹ جائے گا
کوئی جادوگری ہوگی نہ ہوں گے کفر کے فتوے
کہ مذہب بیچنے والوں کا بھانڈا پھوٹ جائے گا
یہ جو مذہب کے متوالے بدی کے تو یہی سالے
بھلا ہو ان کا یہ ہیں عزمِ شیطانی کے رکھوالے

(۵)

سنایا ایک پنچھی نے مجھے مغموم سا نغمہ
کہ مٹنے کو ہیں جگ سے مطلبی یاروں کے یارانے
پڑوسی سے نہ کوئی کہہ سکے گا بعد از سرقہ
''کہ میں ہی اک بجن تیرا حقیقت تو اگر جانے''
نہ بہکائیں گے یاراب یار کی زوجہ ودختر کو

نہ ہوں گے غیبت و جور و ریا کاری کے افسانے
شہنشاہِ شرارت پاپیوں کو اب بچالے تو
جنہیں ہو زعم نیکی ان کو دنیا سے اٹھالے تو

شیطان جھوم کر اٹھتا ہے اور اپنے چیلوں سے یوں خطاب کرتا ہے:

(۶)

مرے چیلو! مری طاقت سے کیوں کر بے خبر ہو تم
مرے دل میں ہو جو کچھ بھی، وہی تقدیر انساں ہے
کبھی سوچا حکومت کس کی ہے شانۂ ہستی پر
کبھی سوچا کہ یزداں تو برائے نام یزداں ہے
کبھی شاہ و گدا رقصاں مرے طرزِ ترنم پر
اگر چہ ان کے ہونٹوں پر سرود اسم رحماں ہے
کروں گا چار ہفتوں تک میں تخلیق سیاست داں
سیاستداں ہے کیا؟ وہ اصل میں ہے عظمت شیطاں

(چار ہفتوں بعد)

(۷)

بتاؤں تم کو اہل شر چھپا کیا ہے پس پردہ؟
کرشمہ یہ مری تخلیق کا یعنی سیاست داں
نظر آتا ہے جیسے یہ کوئی ہو پسر دیوانہ
مگر یکتائے عالم ہے دغابازی میں یہ انساں
زباں میں ضوفشانی ہے مگر تاریک دل اس کا
حیاداری میں کچھوا بے حیائی میں یہ اک طوفاں
بظاہر سادگی اخلاص، دیں داری و غم خواری
حقیقت میں ہے مکاری، ریاکاری، ستم گاری

(۸)

یہ مُلّا، پادری، پنڈت، گرو، پیرِ مغاں سارے
نہیں کچھ اس کے چیلے ہیں درتاویل شیطانی
سبھی اس کے مقلد، ملتجی اور خوش ادا دیکھو
کہ ان سب کے دلِ مردہ پہ ہے اس کی ہی سلطانی
حقیقت میں یہ رہزن ہے لباس رہنمائی میں
کہ ہر اک چال اس کی ایک اعجازِ ستم رانی
جو سچ پوچھو تو مجھ سے بھی کہیں بڑھ کر یہ ظلمت میں
شرارت میں عداوت میں، ذلالت میں، کراہت میں

مہاچیلا (ادب سے عرض کرتا ہے):

(۹)

رقیب خالق عالی: کرم ہو ہم مریدوں پر
اجازت ہو تو اب پردہ جو اخفا کا اٹھادوں میں
بڑھی جاتی ہے بے تابی ہمارے دل دھڑکتے ہیں
مری یہ آرزو ان سب کو اب جلوہ دکھادوں میں
عجوبہ کیا پس پردہ کہ شیطاں سے بھی ہے بدتر
یہ ممکن ہے کہ نظارے سے دل ان کے ہلادوں میں
تعجب کیا کہ شیطاں سے پلوٹھا اس کا بہتر ہے
رقیب خالقِ عالی: ترا احسان ہم پر ہے

(پردہ اٹھتا ہے: شیطانی چیلے حیرت میں ڈوب جاتے ہیں)

(۱۰)

شاعر

اٹھا پردہ تو غل پیدا ہوا یوں: بزم شیطاں میں
کہ جیسے شورِ محشر نے اچانک لی ہو انگڑائی
سیاستداں تھا کیا اک شرضیائے خیر میں لپٹی؟
بدلتا رنگ تھا جیسے کوئی گرگٹ سودائی
تھی اس کہ نگہ متحرک میں کچھ فتنہ گری ایسی
کہ جیسے گرم لوہے میں ہو رنگینی سمٹ آئی
وہ بولے مرحبا تجھ پر جو شر میں سب سے بڑھ کر ہے
ارے یہ پسر شیطاں اپنے بابا سے بھی بدتر ہے

(۱۱)

گھڑی بھر کے لئے لو مڑ پہ ضیغم دوسرے پل میں
اچانک اک جبل لیکن دم ثانی میں تھا رائی
وہ جب ہنستا تو ہو جاتی تھیں آنکھیں اشکبار اس کی
اگر روتا، ٹپکتی زرد رخساروں سے رعنائی
کیا ان پر عیاں یہ راز آخر فرطِ حیرت نے
کہ میدان ریا میں ابنِ شیطاں کو ہے یکتائی
. ہوا غلبہ سیاست داں کی فطرت کا شیطاطیں پر
وہ سب ہی گر پڑے سجدے میں رو کر پائے بے دیں پر

(۱۲)

''فقط میں لائق سجدہ'' کہا شیطاں نے بے بل کھا کر
''نہیں ہرگز گوارا مجھ کو داغ شرک ورسوائی''
مثال رعد کڑکا، پھر وہ سوئے آسماں لپکا
ہوا غائب تماشہ دیکھ کر جیسے تماشائی
لگائے قہقہے چیلوں نے پھر بولے حقارت سے
ضرورت اب کسے اس کی؟ کہ یہ بھڑوا ہے سودائی
یہ لازم سب پہ ہے، کافر ہو چاہے صاحب ایماں
کریں مل کر سبھی وردِ ''سیاست داں، سیاست داں''

انور شیخ کی غزل سے متعلق میری اس کتاب کے طویل و مبسوط دیباچے کا آخری موضوع انور شیخ کی فکشن نگاری ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ وہ اردو، انگریزی نثر نگاری میں یکساں دسترس رکھتے ہیں، دونوں زبانوں کی نثر میں مختلف موضوعات پر ان کی بہت سی کتابیں ہیں اور اردو میں شعری مجموعے۔ ظاہر ہے کہ فکشن جیسی وسیع الخیال اور ضوفشاں ادبی صنف سے وہ صرف نظر کس طرح کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے اس میدان میں بڑا کام کیا اور اردو میں کئی کتابیں شائع کیں۔ ان کی تحریروں میں تنقیدی رفعتوں کی توانائی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر مظفر حسن عالی کی کتاب انور شیخ کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ اہم ہے جس سے بہت کچھ ہمارے سامنے آتا ہے لیکن میں ان کے افسانوں کو ایک منفرد نگاہ سے دیکھتا ہوں اور اکثر و بیشتر ان کے ان نثری فن پاروں کا مختلف زاویوں سے ذہنی تجزیہ کرتا رہا ہوں۔

میرے لئے زبان کا مسئلہ ہمیشہ بہت اہم رہا ہے۔ میرے نزدیک موضوع سے زیادہ اہم زبان کی حلاوت مٹھاس شیرینی اور گھلاوٹ ہوتی ہے۔ میرے مطالعے میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جب موضوع بہت اہم ہوتا ہے مگر زبان سرد و بے رس اور پھیکی،

میں تادیر ایسی کسی تحریر کے ساتھ نہیں رہ سکتا، موضوع ہلکا ہو، زبان شاعرانہ اور شیرینی سے پُر ہو مجھے ایسی تحریریں پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ ہمارے یہاں اردو میں بیشتر افسانہ نگار، ناول نگار شاعر نہیں ہیں لیکن ان کے افسانوں میں شاعرانہ جمالیات ہے۔ میں اکثر یہ کہتا ہوں بلکہ میں نے بعض مقامات پر لکھا بھی ہے کہ میں ایسے افسانہ نگاروں کے متعلق یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے اندر کوئی شاعر چھپا بیٹھا ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ہمارے یہاں کئی فنکار بحیثیت افسانہ نگار مشہور و معروف ہوئے لیکن بعد میں انہوں نے شاعری شروع کر دی تو لوگ انگشت نمائی کرنے لگے کہ شاعری کی کیا ضرورت تھی، ایسا نہیں ہے ان کے درون میں ایک شاعر ہوتا ہے جو اپنے اظہار کے لئے بیقرار ہوتا ہے پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب افسانہ نگار اپنے اندر کے اس شاعر کو باہر لانے پر مجبور ہوتا ہے خواہ کتنی ہی باتیں کہی جائیں لیکن انور شیخ کا معاملہ قطعی الگ ہے وہ ایک بے مثل شاعر بھی ہیں افسانہ نگار بھی۔ ان کی شاعری میں بعض مقامات پر افسانوی رنگ جھلکتا ہے اور افسانوں میں تو انہوں نے زبردست شاعری کی ہے۔ ان کے افسانوں میں افسانوں کی اپنی جمالیات ہے جو کسی طرح شاعری سے الگ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے کئی ملکوں کی تہذیبوں کا مطالعہ کیا ہے۔ عالمی ادب کو اپنے اندر جذب کیا ہے۔ اس صورت میں جو شگفتگی ان کے یہاں در آئی ہے وہ دیدنی ہے۔ طنز و مزاح ان کے مزاج کا ایک حصہ ہے جو ان کی پوری شاعری پر محیط ہے خواہ صنف سخن کوئی بھی ہو وہ جب بھی کوئی نقش بناتے ہیں کھلکھلاتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن الفاظ کی رگوں سے قطرہ قطرہ خون بھی رستا رہتا ہے اگر چشم باطن سے دیکھا جائے تو زمانے کی تمام کروٹوں کو جمالیات کے حوالے سے انہوں نے پرکھا ہے جانچا ہے دیکھا ہے اور سمجھا ہے اور اس فن میں وہ طاق نظر آتے ہیں۔

ایشیا اور یورپ کی سرزمین مختلف سہی، تہذیبیں مختلف سہی مگر دونوں جگہ کے رہنے والوں کے سینوں میں دل یکساں طور پر دھڑکتے ہیں۔ دونوں کی سوغات دل ہے اس لئے ایک فنکار کا فن زمینوں خطوں ملکوں اور جہتوں میں تقسیم نہیں ہوتا، اس کا ایک بین الاقوامی نظریہ ہوتا ہے جس میں آدم خاکی کے عروج اس سے ہم رشتگی کے عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے بہت سے افسانے ''ماں اور عورت''، ''ساس اور بہو'' اور ''حلالہ'' دیکھے

جا سکتے ہیں۔اس کے علاوہ بین الاقوامی تہذیبوں کے مناظر جوان کے افسانوں میں ہیں وہ آج کے کہانی کاروں میں تقریباً مفقود ہیں۔

اس طویل و بسیط مقالے کے اختتام پر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ انور شیخ نے جن میدانوں میں بھی اپنے اشہبِ فکر کو رواں رکھا ہے وہ میدان نہایت شاداب، سرسبز اور سیرابی کے عمل سے آشنا ہے۔ان میں سیر کرنے کا سلسلہ روح کو تازگی عطا کرتا ہے۔میں اپنی اس گفتگو کو عربی کے اس شعر پر ختم کرتے ہوئے اگلے باب سے انور شیخ کی غزل کے متنوع پہلوؤں پر بات چیت شروع کرتا ہوں۔

یلوح الخط بالقرطاس دھراً
وکاتبہ رمیم فی التراب

***

صریرِ قلم نغمۂ سروش

اعتدالِ معانی از من پُرس
کہ مزاجِ سخن شناختہ ام

(فیضی)

اب آپ سے میری التجا ہے کہ اپنی سیاحت کا حال بیان فرمایئے، آپ آباد دنیا کے کن کن حصوں سے گزرے، کیسے کیسے خوبصورت شہر آپ نے دیکھے، اور وہ کون لوگ تھے جو ان شہروں میں بود و باش رکھتے تھے۔ آپ کو غیر مہذب قبائل اور سفاک وحشیوں سے سامنا کرنا پڑا، یا رحم دل خدا ترس افراد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

(اوڈیسی)

انور شیخ کے فن پاروں کی عظیم الشان دنیا کی سیاحت پر نکلیں تو ہزاروں طرح کے محسوسات آنکھیں کھولتے ہیں۔ قوس قزحی جذبے بیدار ہوتے ہیں، جہاں تہہ در تہہ صریرِ قلم میں نغمۂ سروش کا ارتعاش قطرہ قطرہ ہمارے طشت ساعت میں تراوش کرتا ہے، جو ہمیں سرمستیوں اور سرشاریوں کے جہانوں میں بہالے جاتا ہے، جہاں ایک ذرہ اٹھا کر نبض دنیا دیکھنے کا ہنر منکشف ہوتا ہے، اسی طرح کسی بھی فنکار کے فن پاروں سے اس کی شخصیت مترشح ہوتی ہے کیونکہ فن ایک عظیم و بسیط کراں تا کراں محیط ایک آئینہ ہے جس میں تمام گرد و پیش آفریدہ و نا آفریدہ مناظر پناہ گیر ہیں۔ ان میں جلوۂ ذات کا ایک ہجوم ہے، فنکار کے مزاج و منہاج کی غیر فانی کیفیتیں ہیں، جو حجابات اٹھاتی ہیں اور عالم اسرار کی سیر کراتی ہیں۔

انور شیخ کی غزل کا لفظی اور لسانی نظام

ہم سمندر باش وہم ماہی کہ در جیحون عشق
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش ست

(عرفی)

شاخِ قلم میں تو زبان کا پھول بعد میں کھلتا ہے۔ سب سے پہلے وہ ذہن کے افق پر طلوع ہوتا ہے۔ چاروں طرف روشنی بکھیرتا ہے۔ ان تنوع آمیز رنگوں سے ساری فضا آبشار حیرت میں غسل کرنے لگتی ہے اس کے بعد یہ رنگ رفتہ رفتہ تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہ قوس قزحی رنگ مواج سیال کی طرح قلم کی رگوں میں اترتے ہیں۔ پھول کی شکل میں متشکل ہوتے ہیں پھر شاخ قلم لہلہا اٹھتی ہے۔ زبان لفظ کی شکل اختیار کرتی ہے۔ لفظ کا پھول کھلتا ہے اور اپنے وجود سحر آمیز سمیت بساط قرطاس پر اترتا بھی ہے اور اپنے آہنگ سے سامعین کو سرشار کرتا ہے گویا ایک غیر فانی ذائقہ ہے جو لفظ سماعت کو عطا کرتا ہے، سماعت کے طشت بیکراں پر اس کی گونج مسلسل باقی رہتی ہے۔ ارتعاش اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ احساس ابھرتا ہے کہ قلم کار کے یہاں زبان کا تشکیلی نظام ہے کیسا ہے یعنی لفظی و لسانی نظام۔ لیکن یہ صورت حال سب سے زیادہ دلفریب و خوش رنگ ہوتی ہے جب ایک صاحب طرز شاعر کے یہاں لفظ کی گونج اس حیثیت کی ہو کہ اسے فراموش نہ کیا جا سکے۔ اس اجمال کی تفصیل تو بعد میں پیش کی جائیگی فی الوقت تو بات کا آغاز انور شیخ کی غزل کے لسانی اور لفظی نظام سے ہو رہا ہے۔ ان کی غزل کا طرہ امتیاز یہی ہے کہ آواز لفظ کی شکل اختیار کر کے ذہن کے افق پر طلوع ہوتی ہے پھر یہی رعنائی حیات سے لبریز زبان پھول بن کر شاخ قلم میں کھلتی ہے۔ ان کے الفاظ کی تخصیص نہیں ہے وہ اپنے شعری دروبست میں بے محابا اور بے تکلفی سے استعمال ہوتے ہیں اور یہی وصف ہوتا ہے اچھی شاعری کا۔ ہر زبان کی اعلیٰ شاعری

کی یہی خوبی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر زبان میں انواع واقسام کے الفاظ ہوتے ہیں لیکن لفظ اپنے معنی میں سرمایہ دار ہے۔ لفظ کی ظاہری حیثیت کچھ بھی ہو وہ اپنے معنی کے جوہر سے پرکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ معمولی لفظ بھی جب اپنی تخلیقی سطح پر پہنچتے ہیں تو ان کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب غزل کے کچھ لفظ مخصوص کر دیئے جاتے تھے مگر اس تخصیص نے غزل کے افق کو بہت وسیع اور ضوفشاں نہیں ہونے دیا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ مخصوص الفاظ علامتوں اور استعاروں کی شکل میں برتے جاتے رہے اور آج بھی برتے جاتے ہیں لیکن لفظ کا تخلیقی پھیلاؤ اس کے معنی کی وسعت برابر یہ تقاضا کرتی ہے کہ اسے کسی زنداں میں قید نہ کیا جائے بلکہ اسے وسیع و بسیط فضا میں کھل کھیلنے کا موقع دیا جائے اور یہ بات انور شیخ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے الفاظ کا تخلیقی استعمال کیا ہے تمام اصناف سخن میں لیکن غزل میں یہ جلوہ کچھ زیادہ ہی نکھر کر نمودار ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے میں کوئی مثال پیش کروں ان کی غزل سے متعلق معروف جدید غزل گو غلام مرتضیٰ راہی کی یہ رائے دیکھئے جو انور شیخ کی غزل کی تفہیم میں متضاد کیفیت کی حامل ہے:

> ''انور شیخ کی غزلیں بالخصوص سنگلاخ ترزمینوں اور عجیب غریب ردیفوں کے باعث غزل کے عام مزاج سے مختلف ہوتی ہیں۔ وہ ناہموار زمینوں اور فکر واظہار کی اجنبی و نامانوس سمتوں میں قدم رکھنے سے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں غیر شاعرانہ تجربوں اور اسالیب کی بہتات ہے۔ انہوں نے غزلوں میں سپاٹ کھردرے یہاں تک کہ غیر شائستہ اور غیر غزلی الفاظ کا بھی بے دریغ استعمال کیا ہے مشتے نمونہ از خروارے پہلے چند انوکھی ردیفیں ملاحظہ ہوں، نہیں محبوب، ہٹلر ہو، پھر خیالی پلاؤ، کی ایسی تیسی، لیکن اکڑ اکڑ کے، خدا غارت کرے تم کو، بکواس ہے، میں گدھا نہیں، مرا ناس ہو گیا، ناچ ناچ ناچ، تو کیا مسالے دار ہے، ابلیس یہاں ابلیس یہاں، آؤ کہ اک جھک ماریں، تم سے بھی اک دن نپٹ لوں گا، بک بک،

دمادم ہے، اک رگڑ، شیطان جی، الو کا پٹھا وغیرہ۔

انور شیخ نے اپنی غزلوں میں اس قبیل کی طبع زاد ردیفوں کا استعمال کیا ہے جس سے ان کی قادرالکلامی کا ثبوت ملتا ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اور اس طرح کی سیکڑوں ردیفیں غزل میں اضافہ ہیں۔ یہ اضافہ خوشگوار یا قابل قبول ہے یا نہیں یہ امر الگ بحث کا متقاضی ہے۔

انور شیخ کی غزلوں میں مندرجہ ذیل قسم کے الفاظ کے استعمال کی مثالیں کمیاب نہیں ہیں، رنگین بھیڑیا، الو، گدھا، پتھر، پہلوان، الو کا پٹھا، دولتی، شیر ببر، للیا، گھٹالا، چاپلوسی، مکڑا، مکھی، گرگٹ، خچر، گھوڑا، بلی جوتیاں وغیرہ۔

ممکن ہے کہ مندرجہ الفاظ کے استعمال سے انور شیخ نے شعر کے رسمی حدود میں وسعت پیدا کر کے غزل کے دائرۂ اختیار کو رسمی سرگوشیوں سے لا باہر کھڑا کرنے کی سعی فرمائی ہو لیکن یہ لفظیات نہ تو غزل میں اظہار محبت کے کام آسکتے ہیں نہ ان سے غزل میں باریکی حکمت اور شعریت پیدا کی جاسکتی ہے۔

انور شیخ نے ایک فطری اور ہوش مند تخلیق کار کی طرح اپنے عہد کے مسائل کے اظہار اور اصلاح کے واسطے مبلغ یا ناصح کے بجائے شاعر کا رول ادا کیا ہے ایسے اشعار میں زندگی کی اعلیٰ قدروں کا ادراک، انسان دوستی، اندھی عقیدتوں پر طنز و استہزا، ماحول کی سخت گیری اور گھٹن سے باہر نکلنے کی ترکیب اور حقائق حیات سے مفاہمت کے بجائے ستیزہ کاری اور مزاحمت کا عمل فنی نظم و ضبط کے ساتھ ملتا ہے۔''

غلام مرتضیٰ راہی کی اس رائے سے بیشتر مقامات پر اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے لیکن انہوں نے اپنے مضمون میں مثال میں وہ شعر پیش نہیں کئے جس کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ غیر شاعرانہ غیر غزلی یا پھر ناشائستہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ دراصل بات اس

میں یہ ہے کہ انور شیخ کا تو پہلے سے ہی یہ نظریہ موجود ہے کہ غزل صرف حکایت بایار گفتن یا بازناں گفتن کا نام نہیں ہے چنانچہ انہوں نے وہ تمام حدود بھی توڑ دیئے ہیں جہاں پر ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے علاوہ ازیں اس طرح کے الفاظ غزل میں استعمال کر کے انہوں نے بتایا ہے کہ طنز ملیح اور طنز قبیح غزل کے حوالے سے کس طرح ممکن ہے یا پھر زندگی پر ایک طرح کا زہر خند یا خندۂ استہزا کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ ان غزلیہ اشعار پر یہ الزام لگا سکتے ہیں کہ ان میں غنائیت نہیں ہے لیکن جہاں لہجہ تلخ ہو طنز آمیز ہو وہاں غنائیت کیا معنی۔ یقینی طور پر فکر کے باطن سے ناہمواریت اور کھردرا پن ایسی صورت میں ابھرتا ہے اور یہ تخلیق کار کے فن کی اعلیٰ منزلوں پر فائز ہونے کی دلیل ہے۔ اس سے پہلے کہ میں انور شیخ کے غزلیہ اشعار کے حوالے دیگر شعراء کے کچھ تقابلی اشعار پیش کروں، انور شیخ کے ہی کچھ اشعار سامنے لا رہا ہوں:

وہ دوست ہی کیا آئے تو کچھ لے کے ہی آئے
جو لینا ہے لے جایئے تشریف تو رکھئے

پیر جی کا گزارا ہی گڑبر پہ ہے
دوسروں سے کہا ان سے گڑبڑ نہ کر

بنتی نہیں کم ظرف سے گو لاکھ کہیں ہم
قبلہ مرے آقا مری سرکار دمادم

پیری میں جم کے جو لڑا پیری کے ضعف سے
دراصل وہ جوان ہے کیا یہ صحیح نہیں

رسم زمانہ بن چکی تضحیک عقل اب
الو کے سر پہ ہر جگہ دانش کا تاج ہے

نام لیں وہ شوخ کا جیسے کہ ازراہ کرم
دل میں رہتی ہے چبھن کیا چار سو بیسی کا فن

ایسا نہیں ہے کہ انور شیخ کی غزل میں حکایت بایار گفتن کا لطف نہیں ہے، لطف ہے اور خوب ہے۔ انہوں نے اپنے محبوب سے مزے مزے کی باتیں کی ہیں۔ طرح طرح سے اسے طعن و تشنیع کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ پیار اور محبت کی بارش بھی کی ہے، طنز سے بھی کام لیا ہے۔ اسکے جلووں کو منفرد انداز سے پیش بھی کیا ہے۔ کیا ان کی غزل کی یہ انفرادیت فراموش کر دینے کے قابل ہے؟ لیکن جب وہ زمانے سے مخاطب ہوئے ہیں تو انہوں نے اس طرح کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ غزل کو اپنی حدود سے باہر نکالنے کا کام ہمیشہ سے ہی ہوتا رہا ہے، بیان کیلئے کچھ اور وسعت تو درکار ہوتی ہی ہے اس طرح کے تجربے متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، مثالیں دیکھئے:

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

(آتش)

کودا تیرے آنگن میں کوئی دھم سے نہ ہوگا
جو کام کیا ہم نے وہ رستم سے نہ ہوگا

(جرأت)

خیال زلف دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

(نصیر)

وحشی کو ہم نے دیکھا ہے اس آہو چشم کے
جنگل میں بھر رہا ہے قلانچیں ہرن کے ساتھ

(ذوق)

عشق کی کس کے دل میں لاگ نہیں
کون سا گھر ہے جس میں آگ نہیں

(ناسخ)

دیوار پھاندنے میں دیکھوگے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

(انشاء)

دو بوسے پہ راضی نہ ہوا میں تو وہ بولے
تیری تو کسی طرح سے نیت نہیں بھرتی

(انشاء)

ذرا ان کی شوخی تو دیکھئے لئے زلف خم شدہ ہاتھ میں
مرے پاس آئے دبے دبے مجھے سانپ کہہ کے ڈرا دیا

(مصحفی)

متقدمین کے یہاں اس طرح کی مثالیں ہزاروں ہیں اور غزل میں بھی۔ لیکن اگر غزل سے کچھ الگ ہٹ کر دیکھیں تو پھر نذیر اکبر آبادی کی شاعری میں جو حیرت انگیز لفظیات کا انبوہ کثیر ہے وہ ہمارے اوپر یہ منکشف کرتا ہے کہ شاعری اپنی تخلیقی منزلوں میں کس انداز سے رواں دواں ہے۔ متقدمین کے یہاں اس قسم کی مثالیں کچھ اور بھی ہیں لیکن زبان کے ساتھ علاقائی ڈائلکٹ بھی ہے جو تمام تر شاعری پر محیط ہے اس کی تخصیص صرف غزل میں ہی نہیں۔ واضح ہو کہ میں اس کا قطعی قائل نہیں ہوں کہ اصناف سخن کی زبان مختلف ہو، اس طرح اصناف سخن محدود ہو جاتی ہیں نہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ اردو شاعری میں فارسی عربی الفاظ کی کثرت ہو کہ پوری بساط سخن پر تعریب و تفرلیس کی حکمرانی ہو اور نہ یہ کہ سوقیانہ اور بازاری الفاظ استعمال ہوں کہ شعری لہجے سے پستی جھلکنے لگے۔ اس طرح کے محاسن متقدمین، متوسطین اور متاخرین سب کے یہاں موجود ہیں کچھ مثالیں اور پیش ہیں:

عالم ہے جوانی کا کہ ابھرا ہوا سینہ
کیا گات ہے کیا گات ہے کیا گات ہے واللہ

(جرأت)

بھلا درستیِ اعضائے پیر کیا ہووے
کسی نے رسی سے جیسے کواڑ باندھ دیا

(مصحفی)

کسی کے محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی
حباب کے جو مقابل کوئی حباب آیا

(آتش)

دہن شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

(غالب)

تب ہو عاشق کی شبِ وصل تسلی اے گل
مصرف بوسہ ہو جب گل دہن سرخ ترا

(مصحفی)

لٹیں بکھری ہوئی لب پر تبسم
یہ لٹ دھاری بنے آئے کہاں سے

(داغ)

ان اشعار کو پیش کرنے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ انور شیخ کی غزل کا لفظی اور لسانی نظام پوری طرح واضح ہو جائے۔ متقدمین کا رنگِ سخن آپ نے دیکھا اب متوسطین کے یہاں سے کچھ مثالیں دیتا ہوں جو بیحد اہمیت کی حامل ہیں:

باغباں تختۂ گل دیکھ لے کلیاں گن لے
وہ گیا پھاند کے دیوارِ گلستاں کوئی

(سیماب)

حیات و موت کا نکتہ اگر انساں پہ روشن ہو
وہاں بھی نیند آجائے جہاں شیروں کا مسکن ہو

(کوثر جائسی)

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

(یگانہ)

اکا دکا صدائے زنجیر
زنداں میں رات ہوگئی ہے

(فراق)

دل نے وہیں سنیں ترے قدموں کی آہٹیں
چھوڑا تھا میرا ساتھ جہاں انتظار نے

(افسر ناروی)

جنوں میں وادیٔ پرخار سے بھی گزرا ہوں
مگر یہ کیا کہ مرا پیرہن سلامت ہے

(ندرت کانپوری)

حالانکہ ہمارے یہاں اردو شاعری کے دو دبستانوں کا نام لیا جاتا ہے لکھنؤ اور دہلی لیکن میں اس بات سے شدید اختلاف رکھتا ہوں۔ میں پنجاب کو بھی ایک اسکول مانتا ہوں اور میری نظر میں ہر وہ خطہ دبستانِ ادب ہے جہاں سے ہماری زبان کو فروغ ملتا ہو، جہاں جہاں اردو زبان کی نشو ونما ہوتی ہو وہ اپنے خال وخد سنوارتی ہو وہ سب میرے لئے ادبی دبستانوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں کسی خطے کی کوئی تخصیص کیوں ہو۔ زبان، مقامی لہجہ، مقامی ڈائلکٹ سے استفادہ کرتی ہے جو اسے ثروت مند اور توانگر بناتے ہیں، میں زبان کی توسیع اور ترویج کو کسی مخصوص حد میں بند کر کے نہیں دیکھتا ہوں، متقدمین سے لیکر متاخرین تک جہاں جہاں یہ عہد پھیلا ہوا ہے زبان توسیع وترقی سے ہمکنار ہوتی رہی ہے اور جب تک نذیر، انیس، جوش اور انور شیخ جیسے شاعر پیدا ہوتے رہیں گے زبان یونہی ترقی کرتی رہے گی۔ میں حوالے کے طور پر متاخرین کے اشعار بھی پیش کروں گا جس میں وہ غزل بھی ہے جسے ترقی پسندوں نے ٹاٹ برادری باہر کر دیا تھا اور وہ غزل بھی ہے جو بیسویں صدی کے وسط میں پیدا ہوئی یعنی کم وبیش قیام پاکستان کے فوراً بعد۔ اس نے ایک نئے لہجے کی بنیاد رکھی، وہ لہجہ اب نخل ثمر دار

بن چکا ہے جس کے سائے میں ادیبوں شاعروں کی ایک بہت بڑی نسل خود کو سنوارنے میں مصروف ہے۔ کچھ مثالیں پیش ہیں،

امید وصل کے دن کٹ گئے بھٹکنے میں
نہ ہوٹلوں پہ یقیں تھا نہ گھر گئے ہم تم

(انور شعور)

اس میں اب کچھ بھی نہیں چالیس پیسوں کے سوا
پرس میں منھ دیکھ لیتا ہوں تری تصویر کا

(مظفر حنفی)

بستر پہ ایک چاند تراشا تھا لمس نے
تم نے اٹھا کے چائے کے کپ میں ڈبو دیا

(عادل منصوری)

ڈسوایا ہے پھنکارتے سانپوں سے بدن کو
تب جا کے یہ اک دولت فن ہاتھ لگی ہے

(زبیر رضوی)

بھڑکے ہوئے شعلوں کی طرح تیز ہوا ہے
لٹکی ہوئی اک لاش سا دل جھول رہا ہے

(زیب غوری)

شیطاں کے ڈرانے کا کوئی گرز نہ تھا وہ
راکٹ تھا خلاؤں کا جگر چیر رہا تھا

(ابرار اعظمی)

جسم کو سونگھ گیا سانپ اندھیری شب کا
چشم خونبار لئے نیند کی زد میں آیا

(پرکاش فکری)

بدن پر سبز، ہلکی سبز جرسی
عقب میں گندمی گہرا بلاوا

(ظفر اقبال)

عجیب سانپ تھا کل رات میرے بستر میں
سحر کو جسم میں اک بوند بھی لہو نہ ملا

(عشرت ظفر)

مجھے یہ کہنے میں کچھ باک نہیں ہے کہ غزل میں تخلیقی الفاظ کی روایت کو یا پھر متنوع الفاظ کی کثرت کو جو فروغ متاخرین کے کلام سے ملا ہے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ مثالیں پیش کی جا چکی ہیں اور انور شیخ کے یہاں متقدمین سے لیکر متاخرین تک غزل کے حوالے سے تہذیبی اقدار کی تبدیلیاں نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ اور یہ تازیانہ ہے دراصل ان پر جو یہ کہتے ہیں کہ فلاں لفظ غزل کا ہے فلاں نہیں ہے۔ میرے خیال سے ہر لفظ غزل کا ہے اس کو برتا کس انداز سے گیا ہے بحث اس پر ہونی چاہئے، تخلیق کا فنی ویوہار کیا ہے یہ مسئلہ غور طلب ہے۔ اس انداز کی کچھ مثالیں انور شیخ کی غزل سے پیش ہیں:

وعدۂ بوسہ کیا لیکن عوض میں دی چپت
اور نخوت سے کہا تم کون ہو تم کون ہو

سکھایا گردشِ ایام نے جینے کا ڈھنگ آخر
ضروری ہو تو شیطاں سے نبھانا جانتے ہیں ہم

عدو کو پیش کرتے ہو شرابِ انگبیں جانم
ہمیں تلچھٹ پلاتے ہو خدا غارت کرے تم کو

ارے تم بھیڑیئے ہو بھیڑ کے پردے میں اے ہمدم
جتانا چاہو غم خواری تو کھاتے ہو قسم میری

انور شیخ کی آواز اُردو اور انگریزی ادب کے ایوانوں میں غیر فانی چراغوں کی طرح روشن ہے۔ ان پر اساطین و مشاہیر ادب نے بہت کچھ لکھا ہے، یہ سب کچھ ان کے تعارف کے طور پر نہیں ہے بلکہ ادبی دستاویزات مرتب کرنے کا ایک سلسلہ ہے اور ان شاہراہوں کے وہ روشن سنگ میل ہیں جو آنے والی نسلوں کو راستہ دکھا سکیں، لیکن اس ضمن میں یہ اپنا طریقۂ اظہار ہے جو ان کی ہمہ جہت شخصیت، تہذیب فن اور آتش تخلیقیت کو ان تمام جاوداں عناصر کے تناظر میں دیکھنا چاہتا ہے جہاں اس پرشکوہ داستان کا حرف آغاز ایک روشن مینار کی طرح عصری ظلمتوں سے نبرد آزما ہے اور اس سے پھوٹنے والی شعاعیں چہار طرف کے مناظر کو نور کے بے نہایت سمندر میں غسل دے رہی ہیں۔

کم و بیش بیس سال قبل سب سے پہلے میں نے انور شیخ کی کچھ تحریریں پڑھی تھیں اس کے بعد سے مسلسل یہ میرے مطالعہ میں رہی ہیں اور اب جبکہ میں اس دنیائے بے کراں کی سیاحت پر نکل رہا ہوں تو میں نے ان کی متنوع تخلیقی جہتوں میں سے غزل کا انتخاب کیا ہے اور میں غزل کے حوالے سے ہی دیکھنا چاہوں گا کہ انور شیخ نے اس میدان میں ایجادات کے کیا کیا گل بوٹے کھلائے ہیں لیکن اس سے پہلے میں ان تمام جہتوں، صنعتوں اور تخلیقی فن پاروں کا بھی تفصیل سے ذکر کروں گا جو ان کے فکری نظام میں مابہ الامتیاز ہیں اور جہاں ان کا اشہبِ قلم جولاں و جہند ہ نظر آتا ہے۔

انسان خلاق اعظم کا بے مثل شاہکار ہے یہی سبب ہے کہ وہ خود بھی تخلیقیت کی بادۂ ناب سے لبریز ایک ساغر ہے جو بساط حیات پر ایجادات کے رنگ دکھاتا رہتا ہے لیکن اس کا رنگ ایجاد ہر چند کہ خلاق اعظم کا عطیہ ہے مگر عدم تکمیل کے احساسات سے بھرپور، یہ عدم تکمیلیت کا احساس ہی اسے مختلف جہانوں کی سیر کراتا ہے اور تخلیق کار کے تمام تر لمحوں میں ایک لمحہ ایسا بھی ہوتا ہے جب نگار حیات و کائنات خود کو اس پر منکشف کرتی ہے، دریچۂ بند قبا کھولتی ہے اور جہان اسرار کی دعوت دیتی ہے۔

یہاں اُس ارض حسن و جمال کا ذکر ضروری ہے جس کی آغوش میں انور شیخ کا جنم ہوا، جس نے ان کے مزاج کے خواص کو بنایا، سنوارا۔ میری مراد پنجاب کی سرزمین سے ہے جو میرے لئے ہمیشہ کشش کا باعث رہی ہے۔ جہاں زرخیزیوں کا ایک جہانِ لامتناہی ہے، علم

کیوں نہ بھونرے کی طرح منڈلاؤں تم پر جان من
سن مری زہرہ جبیں دل پھینک ہوں دل پھینک ہوں

خدا تم کو ہدایت دے نہ اے فتنوں کی شہزادی
کہ جب چکر چلاؤ تم بڑی نمکین لگتی ہو

ہم سے کیونکر ہیں خفا؟ بتلایئے بھگوان جی
کیا ہماری ہے خطا؟ بتلایئے بھگوان جی

نہیں مرد میں بن گیا جیسے لڈو
مجھے تو گھمائے خیالی پلاؤ

وہی باتیں وہی گھاتیں وہی فرقت زدہ راتیں
ملو جب بھی بناؤ تم نہیں محبوب ہٹلر ہو

جو مشکل دور میں آنکھیں چرائے
ارے اس یار کی ایسی کی تیسی

ہمیں الو بناتے ہو ستاتے ورغلاتے ہو
حقیقت میں تو مہ پارو جہاں والے سبھی پاگل

پیغام وصل میں بھی کیا شوخیاں ہیں یارب
آنکھیں تو وہ ملائیں لیکن اکڑ اکڑ کے

جو کہ آزادی کا دشمن ہو غلامی کا ولی
غور سے سوچو اگر وہ نان اک بکواس ہے

جو کہ ہے ہر دم بدلتا میں تو وہ گرگٹ نہیں
ہر پری پر جو ہے مرتا میں تو وہ گرگٹ نہیں

جو دشمن وصال، وہ ہرگز حیا نہیں
ایسی حیا تو اے خدا ہڈی کباب میں

جسے سب کہتے تھے الو کا پٹھا بے خبر جاہل
وہی اب ہم کو سمجھائے قیامت اور کیا ہوگی

اگر پینے کی ہمت ہے غٹا غٹ پی غٹا غٹا پی
یہی تو اوج رفعت ہے غٹا غٹ پی غٹا غٹ پی

میں الو ہوں میں خر ہوں بولئے کچھ اور کہنا ہے
میں زاغ بے ہنر ہوں بولئے کچھ اور کہنا ہے

کوئی جیون ہے چپراسی کا اس دنیا میں اے یارو
یہی بہتر کہ میں افسر یہی کہتا ہے دل میرا

ریاکاری ہے وہ پیشہ سیاست جس کو کہتے ہیں
اگر دو زہر مکاروں کو دھیرے سے کہو گڑ گڑ

ترا پیشہ جفاکاری مرا مسلک وفاداری
یہی سچ اے گل احمر کہ میں میں اور تو تو ہے

انور شیخ کے شعری مجموعے ''نوائے دل'' پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ان کی غزل سے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

''انور شیخ کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں، کئی اختراعی اصناف اردو کو دے چکے ہیں جنہیں قبولیت بھی حاصل ہوئی لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں ان کی غزلیں نفس مضمون کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی صداقت اور سنجیدگی کی خصوصیت رکھتی ہیں انور شیخ کا رویہ زندگی پر ان کی تنقید وسعت نظر آزاد خیالی فراخ دلی پر مبنی ہیں۔ اعلیٰ تہذیبی سنجیدگی ان کے تصورات حیات میں موجود ہے، ان کے تصورات کی وسعت اور احساس کی بے پناہ شدت میں ان کا فن مضمر ہے۔''

کہا مرشد نے گر تعویذ کا الٹا اثر تو کیا
دبا پاؤں دلوں کو تو گھمانا جانتے ہو ہم

نہیں کچھ غم لٹیروں کا نہ اندھیروں سویروں کا
ہوئے ہیں جب سے ہم بے گھر کھواس میں برا کیا ہے

سن کے وہ شرمیلے پن سے بن گئی خود چاندنی
دیکھ تیری ہی طرح سے ماہ نو خانہ خراب

مناظر عاشق ہرگانوی ہمارے اردو ادب کا ایک بڑا ستون ہیں ان کی رائے انور شیخ کی غزلوں کیلئے بیحد جامع ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انور شیخ کی غزل کے

لفظی اور لسانی نظام سے مطمئن ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کی اردو ادب پر گہری نگاہ ہوگی وہ کبھی انور شیخ کی غزل کے لفظی اور لسانی نظام سے انحراف نہیں کر سکتا حالانکہ مشکل ردیفیں یا لمبی ردیفیں شعر کے معنوی حسن پر قدرے اثر انداز ہوتی ہیں لیکن اس کا سب سے مثبت پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں ایک آہنگ پیدا کرتی ہیں خاص طور پر شعر کی قرأت میں اس کا نمایاں مقام ہوتا ہے اور شعر کی قرأت ہی معنوی حسن کو دوبالا کرتی ہے جب بلند آہنگ لہجے سے شعر میں آنے والے الفاظ گونجتے ہیں تو ایک سماں پیدا ہوتا ہے اور انور شیخ کی غزل میں اس طرح کی کیفیات پوری طرح ظاہر ہیں۔ ہمارے یہاں شعرا لمبی ردیفوں سے احتراز برتتے ہیں لیکن یہ احتراز و اجتناب شعر کو ایک بلند اور غنائیت آمیز آہنگ سے محروم کر دیتا ہے۔

انور شیخ نے چھوٹی بحروں میں بھی اس طرح کی ردیفیں چسپاں کی ہیں جو ان کے فکری نظام کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ فن بھی دراصل انہوں نے متقدمین سے سیکھا ہے جہاں یاد ہو کہ نہ یاد ہو، یوں بھی ہے اور یوں بھی، ہوا سو ہوا، جیسی بلند آہنگ ردیفیں پائی جاتی ہیں اس طرح انور شیخ غزل کو ایک منفرد آہنگ دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن انور شیخ کی غزل کا لفظی اور لسانی نظام وہ بھی ہے جسے عام طور پر غزل کی غنائیت سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے کھردرے الفاظ کا ہی غزل میں استعمال کیا ہے انہوں نے بیشتر مقامات پر کھردرے لفظوں پر اپنی فکر کا رندہ چلا کر انہیں چکنا چوکور خوبصورت اور دیدہ زیب بنا دیا ہے، دراصل یہ ان کی فکر کا کمال ہے اس لئے اس نقطہ نظر سے بھی ان کی غزل کا مطالعہ کیا جانا چاہئے، ایسی صورت میں تشکیل شعر کی منزل مشکل ہوتی ہے اس شاعر کے لئے جس کے یہاں تخلیقیت کا مواج سمندر ہو کہ وہ کس طرح ان میں سے غنائیت کے گوہر آبدار چن کر نکالے، انہیں سمندر کے ساحل پر سجائے پھر اس کی متجسس نگاہیں اسے تلاش کریں جو ان آبدار گوہروں کا پارکھی ہو۔ اس دور میں سمندروں کی گہرائیوں سے ایسے صدفوں کا تلاش کرنا جن کے بطن میں آسودہ و آرام گیر گوہروں میں آبداری کا تموج ہو بیحد مشکل کام ہے، پھر بے حد صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے ان کے پارکھیوں کی تلاش کا لیکن تخلیق کار چونکہ تخلیق فن کے نشے میں چور ہوتا ہے اسلئے اسے نہ تو اپنی تکلیفوں کا احساس ہوتا ہے اور نہ گوہر شناسوں کے فقدان کا اور پھر اس دور میں تو وہ فنکار بیحد عظیم ہے جو غالب کے اس شعر کے مصداق ہے:

دراں دیار کہ گوہر خریدن آئیں نیست
دکاں کشودہ ام و قیمت گہر گویم

اس صورت میں ضروری ہے کہ انور شیخ کے غزل کے لسانی اور لفظی نظام کے اس دوسرے رنگ کا بھی جائزہ لیا جائے جو خالص غنائیت سے عبارت ہے لیکن ان کی غزل کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں کہیں انور شیخ کے یہاں غنائیت اپنے عروج پر نظر آتی ہے وہاں کہیں نہ کہیں سے غیر ارادی طور پر داغ دہلوی کا لہجہ بھی چمک اٹھتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ الفاظ پر قدرت اور بالخصوص محبوب سے بیباک گفتگو ہے، لیکن اس میں امتیاز یہ ہے کہ داغ کے یہاں جو کچھ بھی ہے وہ حکایت بایار گفتن تک ہی محدود ہے مگر انور شیخ نے اپنے پورے عہد کو سمیٹا ہے، ان کی غزل کا افق وسیع ہے لیکن لہجہ جس کلاسک سے نکلا ہے وہ غزل کا اصل مزاج ہے:

تمہیں صحرا نوردی کی ضرورت اب نہیں ہمدم
سمجھ لوگے ہے کیا چاہت ہمارے دل پہ دستک دو

تیری نگاہ ناز میں کچھ ایسی بجلیاں
گر ہم فریب عاشقی میں لٹ گئے تو کیا

منزل کبھی نہ پاس ترے آئے اے ندیم
گر اس کی جستجو ہے تجھے تیز تیز چل

بوسے تو غیر کو ملے مجھ کو نزاکتیں
اے دل کشا میں طفل تسلی کو کیا کروں

جو کہا اس نے سنا غصے میں کیا کیا بک گیا
سب مجھے اچھا لگا اب دل ہی قابو میں نہیں

ظالم نے ہاتھ کھینچا میں نے اگر بڑھایا
یوں ہر گھڑی ستایا پھر بھی میں خندہ زن ہوں

مزاجِ حسن یخ بستہ کہو اس کا بھروسہ کیا
کروں دانستہ سر کیوں خم مگر میرا نہ دل مانے

غضب ہے مہ رو رقیب کے گھر ہمیشہ ہی بن بلائے جاؤ
بلائیں ہم تو کبھی نہ آؤ تمہارے دل میں جو تم ہی جانو

اے مغنی قصہ غم پھر سنا پر جوش سے
یہ نہیں کوئی فسانہ ساز دل خاموش ہے

مجھے فکر انا ہے کچھ نہیں پرواہ منصب کی
یہی ہے میری خو یارب کہ میں قسمت سے ٹکراؤں

ہوتا نہیں اثر کچھ تیر نظر کا تم پر
آنکھیں لڑا لڑا کر اے یار تھک گیا ہوں

نہیں ممکن یہ اے گلرو کہ حوروں میں ہو گن ایسا
ہوں میں شاداں، ترے انکار میں اقرار کی لذت

کوئی سنتا نہیں کس کو سناؤں کون بتلائے
سسکتا ہے مرے سینے میں اب تو سوز دل اپنا

اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ متقدمین، متوسطین، متاخرین کے یہاں غزل کا جو

نظام ہے اس کا بھرپور انداز ان کی غزل میں ملتا ہے۔ اس سلسلے میں متاخرین کا بھی کچھ رنگ کلام پیش کیا جانا ضروری ہے تا کہ اس بات کا اندازہ لگایا جا سکے کہ انور شیخ کی فکر کن کن جہانوں کو سمیٹتی ہے۔ کوئی بھی زمانہ ہو، کوئی بھی فضا ہو، کوئی بھی کائنات ہو سب ان کے شہپر فکر کی زد میں ہیں۔ متاخرین کا رنگ کلام:

اک آبشار سر کوہسار نکلا ہے
اک ایک سنگ کے دل کا غبار نکلا ہے

(غلام مرتضیٰ راہی)

وہی گلشن ہے لیکن وقت کی رفتار تو دیکھو
کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں

(احمد مشتاق)

کچھ شجر تھے اور پگڈنڈی سی اک جاتی ہوئی
کیا یہ سچ مچ خواب ہے کچھ بھی یہاں ایسا نہ تھا

(باقی)

غنیم وقت کے حملوں کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں

(سلیم احمد)

خستہ دیوار کے سائے میں گھٹا سے ڈرنا
مینھ تھم جائے تو سیلاب ہوا سے ڈرنا

(زیب غوری)

قریب تیر رہا تھا بطوں کا اک جوڑا
میں آبجو کے کنارے اداس بیٹھا تھا

(شکیب جلالی)

خود اس کے ہی اندر سے ابھرتا ہے یہ موسم
جو رنگ بچھا دیتا ہے تتلی کے پروں پر

(اطہر نفیس)

دل لرزتا ہے شاخ گل کی طرح
دفعتاً کون کر گیا پرواز

(رئیس امروہوی)

اس پر بھی دشمنوں کا کہیں سایہ پڑ گیا
غم سا پرانا دوست بھی آخر بچھڑ گیا

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

وہ ظالم دیکھ لیتا ہے تو دل پر تیر چلتے ہیں
پلک جھپکائے تو تلوار پر تلوار گرتی ہے

(مظفر حنفی)

جب سے ہوئے ہیں بند دریچے پڑوس کے
خوشبو کا سلسلہ بھی مرے گھر سے کٹ گیا

(یاور وارثی)

اب اشعار کے تناظر میں انور شیخ کی غزل کا لفظی و فکری نظام بھی دیکھا جائے کہ وہ کس رنگ سخن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان کے یہاں غزل میں ڈرامائی انداز ہے۔ طرز تخاطب میں تنوع ہے اور لمبی لمبی ردیفیں خوب مزہ دیتی ہیں:

نہیں تو راکھ، شعلہ ہے ابھرتا رہ دہکتا رہ
ضیا پاشی کا بن اختر، بھروسہ کر نہ اوروں پر

صدف ڈھونڈنا جیسے کوئی ہو موتی
نہیں جستجو اب سراب نظر ہے

ایک ہنگامہ سے وابستہ ہوں جس کی لذتیں
یہ نہیں ممکن وہاں کچھ کام آئے چشم تر

تکمیل آرزو تو بڑا سب سے مسئلہ
جس کی کمی نہیں کہیں وہ احتیاج ہے

یہ جادو ہے تیری نگاہوں کا جانم
کہ سوکھے تنے پر گلاب آگیا ہے

چھپائے سے چھپے کب آتش غم
کہ دل ،رخ سے عیاں ہونے لگا ہے

بنا کچھ اس طرح کا آشیانہ
کہ ناممکن اسے بجلی، جلا دے

فنون لطیفہ میں شاعری ہی ایک ایسی صنف ہے جو الفاظ کی شکل میں اپنے وجود کا اظہار کرتی ہے۔ الفاظ میں موسیقی بھی ہوتی ہے اور رنگ بھی ہوتے ہیں یعنی مصوری بھی اور وہ مدھر لہریں بھی جو انسان کو نادیدہ جزیروں کی طرف بہالے جاتی ہیں۔ لیکن شاعری کی ہزاروں اصناف میں سے غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جو لہجوں کے تنوع سے عبارت ہے۔ اس کی مثال ہمارے غزل گو شعراء کے یہاں کثیر شکل میں ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ الفاظ کا مزاج شناس ہونا تو شاعر کا سب سے بڑا وصف ہے ہی غزل میں آنے والے الفاظ کا مزاج شناس ہونا بڑی بات ہے۔

اب جبکہ غزل کا افق بیحد وسیع ہو چکا ہے، یہ طلسم ٹوٹ چکا ہے کہ غزل کی زبان کیا ہونی چاہئے پہلا حوالہ انور شیخ کی غزل کا ہی دیا جا سکتا ہے جہاں الفاظ میں تنوع ہے کثرت ہے۔ اس تنوع میں ایک آہنگ ہے، ایک خوش صوت زیریں لہر جو مسلسل گونجتی رہتی ہے جیسے کہ دریا کی آہستہ خرامی اور اس میں گونجتی ہوئی جوئے مہتاب کی موسیقی۔ لفظ کو معنی دینے کا کام شاعر کرتا ہے، اس میں اپنے جذبات کے حوالے سے رنگ بھرتا ہے، انہیں جاوداں بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انور شیخ کی غزل میں مخاطب کوئی بھی ہو سکتا ہے وہ خود بھی ہو سکتے ہیں لیکن اپنے گرد بکھری ہوئی اشیاء اور منظروں کو سمیٹنے کا کام ان کا آئینۂ فکر کرتا ہے۔ میرے نزدیک تمام اصناف سخن میں غزل گوئی سب سے مشکل فن ہے کیونکہ اصل میں یہ ایک ایسا دریا ہے جس کی گہرائیوں میں آتش کدے روشن ہیں لیکن جس کی سطح نرم و خنک ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دریا میں وہی رہ سکتا ہے جو سمندر و ماہی (آگ کا کیڑا اور مچھلی) کا مزاج رکھتا ہو۔ یعنی پرسکون اور ٹھنڈے پانی سے بھی حظ حاصل کرے اور جب گہرائیوں میں اترے تو آتش کدوں کی حرارت کو بھی اپنے اندر جذب کرے مقصد یہ ہے کہ غزل ایک ایسا نخل ہے جس کو خون جگر سے سینچنا پڑتا ہے اور خون جگر کی بنیاد عشق پر رکھی ہوئی ہے اور بقول میر ؎

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

***

وادب ،رقص وموسیقی ،ایجاد واختراع کیا نہیں ہے اس سرزمین رعنا میں ،اس خاک سے وہ غواص معانی اٹھے ہیں جن کے لئے تمام پر آشوب عمیق و بے کراں سمندر پایاب ہیں ،اسی سرزمین کے ملک پور چاہڑہ یعنی اپنے ننہال میں ہمارے فنکار نے یکم جون ۱۹۲۸ء کو آنکھیں کھولیں اوراس دنیائے آب وگل کا پہلی بار نظارہ کیا،بعد میں انہوں نے لالہ موسیٰ ضلع گجرات میں بودوباش اختیار کی جوان کا وطن بھی تھا وہیں انہوں نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور وہیں ان کی پہلی شادی بھی ہوئی۔

علم نجوم کی رو سے یہ زمانہ برج جوزا کا تھا اور اس برج کا حاکم عطارد اپنی مسند حکمرانی پر بصد جاہ وجلال متمکن تھا ،عطارد علم وفن کا ستارہ ہے اوران دنوں میں اس کا سفر مثبت ہوتا ہے، جوزا،حسن وعشق ،جسمانی ملاپ ،جنسی برانگیختگی ،قربتوں اور سرمستیوں کی قیام گاہ ہے چنانچہ انور شیخ کی زندگی میں اس طرح کے جولمحات آئے ہیں ان کی مظہران کی شاعری بھی ہے اور تخلیقی نثر بھی ،دلچسپ بات یہ ہے کہ برطانیہ کا ستارہ مریخ ہے جو عطارد کا دوست ہے اس لئے وہ سرزمین انور شیخ کو راس آئی جہاں وہ معاشی طور پر بھی سرسبز ہوئے اور علمی وادبی طور پر بھی اور شہرتوں کے مینار بابل پر متمکن ہوئے لیکن اس پہلو کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو علم کا گہوارہ تھا ،ہر شخص علم وادب کا دلدادہ ،یوں دیکھیں تو ان کے خون میں علم کی خوشبو رچی بسی ہے ،یہ ایک فطری بات ہے اعلیٰ تعلیم ،عربی ،فارسی ،انگریزی ،اردو نے ان کے ذہن کے تمام دریچوں کو روشن کر دیا ،ان کی تحریریں مظہر ہیں کہ وہ دقیانوسی تقدیر کے قائل نہیں ہیں ،یہ ایک اچھی بات ہے ،دکان بند کر کے بیٹھ رہنا ،ہاتھ پر ہاتھ دھر کر یہ سوچنا کہ بغیر تحرک وعمل کے سب کچھ مل جائے گا فضول ہے ،تحرک اور عمل ہی زندگی ہے ،انور شیخ نے متحرک زندگی کو ہی حرز جاں بنایا ،اسلوب حیات کی اسی انداز میں تشکیل کی اور بلند مرتبے پر فائز ہوئے ،عام انسانی معاشرے میں ایک ادیب شاعر ،فنکار ،تخلیق کار خواہ فنون لطیفہ کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو اس لئے کوئی جگہ حاصل نہیں کر پاتا کہ وہ اپنی فکر ،اپنی سوچ کا ایک بڑا حصہ دنیاوی اثاثوں کے حصول پر صرف نہیں کرتا بلکہ خوابوں اور تفکیر کی دنیا میں مگن رہتا ہے ،افلاطون نے شاید اسی بنیاد پر شاعر کو سماج سے ٹاٹ برادری باہر کرنے کی بات کہی ہے مگر ایسا نہیں ہے ،یہاں یہ نکتہ فراموش

انور شیخ کی غزل میں رومانیت وارضیت

پروانہ ایم شعلہ بود آشیانِ ما
آب از شرار سنگ خورد گلستانِ ما

(نظیری)

انور شیخ کی غزل میں براہ راست اظہار خیال کا انداز ہے۔ فلسفہ کی پیچیدگی نہیں، ابلاغ وترسیل کے شاداب سبزہ زار ہیں۔ کوہساروں سے سر پھوڑنے کا عمل نہیں۔ بیباکی، برجستگی، الفاظ کا برمحل استعمال ان کا طرۂ امتیاز۔ اوران سب کے پردوں میں رومانوی، الف لیلوی فضا ہے جوان کے تمام کلام پر محیط ہے اور یہ جلوہ غزل میں سب سے زیادہ نمایاں ہے یعنی وہ سب کچھ ہے جو ایک اچھے شعر میں ہونا چاہئے۔ معنویت اوراس کے حوالے سے تمام زبانوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی غزل کی بنیاد میں حسن وعشق کی جوآگ کارفرما ہے وہ بیحد تمازت خیز، حرارت آمیز اور سیال ہے اس لئے بات کہیں سے بھی شروع ہوتان رومانیت پر ہی آکر ٹوٹتی ہے۔ وہ طنز سے بھی کام لیتے ہیں تو اس میں بھی کہیں نہ کہیں حسن وعشق کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ ایک ایسا پروانہ ہیں جس کا آشیانہ شعلے میں ہے۔ یہ پروانہ شعلے کے مرغزار میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ اسے کوئی چیز کیا گزند پہونچا سکتی ہے اور جو باغ شرار سنگ سے اپنی قوت نمو حاصل کرتا ہو اسے دیگر اشیاء میں قیام پذیر توانائیوں کی کیا فکر ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں ایک طرح کی بے نیازی ہے۔ اس میں جل کر مرنے کا انداز نہیں ہے بلکہ حصار شعلہ میں بیٹھ کر زندگی کا مطالعہ کرنے کا دلچسپ منظر موجود ہے۔

دست مہ رو کیوں نہ ہو محتاجِ شانہ اے ندیم
خود بخود تو گیسوئے دلکش نہیں سکتے سنور

جو کہ بھر جائے اسے تو زخم دل کہتے نہیں
زخم دل ہوتا ہے گہرا گر کریں اس کو رفو

ڈروں کیونکر بڑا ہے لطف دریا کی روانی میں
جنہیں طوفاں سے لڑنا ہو وہی رہتے ہیں پانی میں

رومانیت خود میں ایک وسیع و بسیط منظر نامہ ہے۔ اسے محدود دائروں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ الفاظ دراصل آواز کے خدوخال ہوتے ہیں۔ آواز کے چہرے کو متشکل کرتے ہیں، اس کے بعد جب جذبے کی آگ میں نہا کر اور کندن ہو کر نکلتے ہیں تبھی ان میں رومانیت پیدا ہوتی ہے۔ رومانیت ایک کثیر الجہت، کثیر المعنویت منظر نامہ ہے۔ اس کا تعلق ہر اس لمحۂ حیات سے ہے جو زندہ و تابندہ ہے اور جس سے تازہ تازہ خون ٹپک رہا ہے، ہماری اردو شاعری میں کچھ شاعروں کو شاعر رومان کہہ دیا گیا لیکن میرے نزدیک یہ طریقہ کچھ مستحسن نہیں۔ کسی نے کہا کہ مجاز اردو شاعری کا جان کیٹس تھا یہ ایک فضول سی بات ہے، جان کیٹس کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت فکر کا مقابلہ کبھی بھی مجاز کی محدود فضا میں سانس لینے والی فکر سخن نہیں کر سکتی۔ اختر شیرانی کو شاعر رومان کہا، جوش ملیح آبادی کو شاعر رومان کہا گیا لیکن سچ تو یہی ہے کہ ہمارے یہاں رومانیت کی تشریح، تفسیر اور تعبیر سب غلط طریقے سے کی گئی ہے جسے جو چاہا نام دے دیا۔ یورپ میں رومانی شعراء کا ایک عہد ہے اس کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو کچھ عقدہ کھلتا ہے کہ اصل میں رومانیت کیا چیز ہے۔ مظاہر فطرت کے حوالے سے اشیاء کے حوالے سے جذبات انسانی کا مشاہدہ کرنا ہی اصل میں رومانیت ہے۔ کولرج کے یہاں چاند کا ذکر کس قدر رومانی فضا پیدا کرتا ہے، اسی طرح بائرن، کیٹس، ورڈورتھ، شیلی سبھی اپنے میدان کے شہسوار ہیں اور کس قدر خوبصورت انداز میں مظاہر فطرت کے حسن کو بیان کرتے ہیں کہ انسانی روح میں آتش کدے روشن ہو جاتے ہیں۔

میں نے انور شیخ کے تین شعر سامنے رکھے ہیں جن کے حوالے سے میں ان کی غزل کی رومانیت پر بات شروع کرتا ہوں، حالانکہ شعر اول میں ایک بہت پرانا خیال آیا ہے یعنی شانہ اور گیسو لیکن شانہ اور گیسو کو محض حسینانِ خوش اندام کے بالوں اور کنگھی تک محدود رکھا جاتا

ہے تو یہ شعر کے ساتھ بڑا ستم ہوگا اس شعر میں ''دست مہ رو'' کی ترکیب محل نظر ہے یعنی محبوب کا ہاتھ جو خود کنگھی سے مشابہ ہے مگر گیسو سنوار نہیں سکتا، شانہ اس کی گرفت میں آتا ہے، گیسو سنوارتا ہے۔ شعر میں ایک وسیع کینوس ہے جس میں انتہائی سلیقہ وحسن تدبیر سے زندگی کے بکھرے ہوئے اجزا کو جمع کرنے کی بات کہی گئی ہے یعنی زندگی خود سے نہ سنور سکتی ہے نہ خود کو سمیٹ سکتی ہے اسے ان تمام کاموں کے لئے ایک سلیقہ مند انسان کی ضرورت ہے جو زندگی کو سنوارتا ہے، یکجا کرتا ہے، نک سک سے درست کرتا ہے، انفرادی واجتماعی طور پر زندگی کو نگار حیات کو ایک جہت دیتا ہے۔ یوں دیکھیں تو اس شعر میں آئینہ کہیں نہیں ہے لیکن آئینہ موجود ہے یعنی وہ لمحہ جس کی بساط پر زندگی خود کو سنوارتی ہے۔ ساری اردو شاعری خصوصاً غزل میں آئینہ، شانہ، زلف سب کا ذکر ہے لیکن شانہ وزلف کی اس منزل میں آنے کا ذکر کم ہی آیا ہے مثلاً شاد عارفی نے کہا ہے کہ

آج اس طرح دبے پاؤں پہنچ لوں کہ اسے
شانہ رکھے نہ بنے زلف بنائے نہ بنے

اس طرح انور شیخ کے شعر میں رومانیت یوں ظاہر ہوئی کہ گیسو، شانہ، دست مہ رو سب ایک دوسرے کے محتاج نہیں ہیں بلکہ عاشق ہیں یہ عشق کی تثلیث ہے جس کی پرستش کی جانی چاہئے۔

دوسرے شعر میں شاعر نے زخم دل رفو کرنے کی بات کہی ہے یعنی جس قدر اسے رفو کیا جاتا ہے اسی قدر وہ گہرا ہوتا جاتا ہے، کیسی عجیب بات ہے بے حد رومان خیز۔ اصل میں زخم دل رفو کرنے کیلئے تو ہوتا ہی نہیں ہے اگر زخم دل رفو کریں تو پھر لطف کیا ہے کیونکہ زخم تو دراصل ایک خوبصورت دہن ہے جس سے گفتگو کا کام لیا جاتا ہے۔ غالب نے کہا ہے ؎

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل ہے تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

ظاہر ہے کہ جب زخم رفو ہو جاتا ہے تو پھر راہ سخن بند ہو جاتی ہے۔ انور شیخ نے بھی ایسی ہی کچھ بات اپنے شعر میں پیدا کی ہے کہ اگر بھر جائے تو پھر زخم دل کہاں مزہ تو اسی میں ہے کہ زخم نہ بھرے راہ سخن وا رہے۔ مصحفی نے کہا ہے ؎

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بڑا کام رفو کا نکلا

ظاہر ہے کہ یہاں تو زخموں کا انبار ہے، سب محو کلام ہیں، ان کی زبانوں کو کس طرح بند کیا جائے قطعی ناممکن ہے اس لئے رفو کا بڑا کام نکل آنے کے بعد یہ سلسلہ موقوف کیا جاتا ہے یعنی رفو کا کام بند اور زخموں کی گہرائی ناپی جاتی ہے۔ اس موضوع پر جدید غزل گو ظفر اقبال کے اس شعر کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

پھٹے پرانے دلوں کی خبر نہیں لیتا
اگرچہ جانتا ہے حاجت رفو ہے بہت

انور شیخ نے قدیم اردو شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے وہاں سے گوہر آبدار نکالے ہیں لیکن ہر خیال میں ہر مضمون میں ایک نیا پہلو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور رومانوی پر اسرار فضا تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ تیسرا شعر بادی النظر میں تو رومانی نہیں لگتا ہے لیکن زندگی کے جس پہلو کا اس میں بیان کیا گیا ہے وہ بے حد تعریف کے قابل ہے۔ انہیں دریا کی روانی و بے کرانی میں لطف محسوس ہوتا ہے خوف نہیں ظاہر ہے کہ جب طوفان سے لڑنا ہے تو پھر پانی کی غضب ناک روانی اور حد نگاہ تک پھیلی ہوئی بے کرانی میں ہی رہنا پڑے گا چنانچہ وہ رہنا چاہتے ہیں، یہ ہے نگار حیات کی عشوہ طرازیوں پر مرنا، اس کے ناز نخرے اٹھانا، اس کے غصے کا مقابلہ کرنا۔ حالانکہ اس غصے میں ایک پیار پوشیدہ ہے کہ جب نگار حیات کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کا عاشق ثابت قدم ہے اس کے مزاج کی تمام تر کیفیتوں سے مقابلہ کر سکتا ہے تو وہ بھی باہوں میں آجانے میں دیر نہیں کرتی دریچہ بند قبا کشادہ کرتی ہے اور عالم اسرار کی سیر کراتی ہے۔ انور شیخ اس راز سے واقف ہیں اور اس صبر آزما منزل میں بھی عشق کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ وہ زندگی کے کیف و کم کو سمجھتے ہیں ورنہ زندگی کی سخت کوشی کا شاکی کون نہیں رہا۔ میں اس ضمن میں سعدی، حافظ، نظیری کے اشعار پیش کرتا ہوں جو زندگی کی غضب ناکی سے بیزار تھے، آسودگان ساحل کی صف میں رہنا چاہتے تھے، علامتوں اور استعاروں کی زبان میں انہوں نے کچھ اس طرح کے شکوے کئے ہیں۔

از ورطۂ ماء خبر نہ دارد
آسودہ کہ بر کنار دریاست

(سعدی)

شب تاریک وبیم موج گردابے چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

(حافظ)

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگران نخوردہ گزند راچہ خبر

(نظیری)

ان اشعار میں سعدی کے شعر کو اس لئے زیادہ اہمیت کا حامل کہا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے کہا گیا ہے حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ بیان میں سعدی و حافظ دونوں کے شعر کمزور ہیں ہاں نظیری کا شعر اہم ہے کیونکہ اس میں ایک خبری انداز ہے استعارے بدل گئے ہیں واحد یا جمع متکلم کی ضمیر استعمال نہیں ہوئی ہے جبکہ سعدی و حافظ کے یہاں دریا بھنور ساحل سب میں بے حد مماثلت ہے۔ حافظ کا شعر سب سے زیادہ کمزور ہے لیکن انور شیخ نے ان تینوں شعروں کی زیریں تہوں میں سانس لیتی ہوئی شکستگی و پسپائی سے کہیں بلند ہو کر شعر کہا ہے اور بتایا ہے کہ وہ زندگی کی ہنگامہ خیزیوں کے عاشق ہیں وہ ''بر کنار دریا'' نہیں رہنا چاہتے ''سبکساران ساحل'' میں سے نہیں ہیں اور ان کا شمار ''نواگران نخوردہ گزند'' میں نہیں کیا جانا چاہئے۔

رومانیت کے حوالے سے انور شیخ کی غزل پر گفتگو کرتے ہوئے اس مٹی کی خوشبو کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جس سے ان کا خمیر اٹھا ہے، جس نے انہیں مچلنے، تڑپنے، جلنے اور سبزہ زاروں کو مسلسل شاداب رکھنے کا ہنر سکھایا ہے۔ اس مٹی میں سوز عشق بھی ہے اور گداختگی بھی اور حسن کے تئیں ایک احترام بھی نیز اس کی عظمت کا اعتراف بھی ہے۔ انور شیخ کی غزل میں رومانیت کا یہ وہ پہلو ہے جو ارضی حسن سے عبارت ہے اور اس طرح رومانیت وارضیت لازم وملزوم بن جاتی ہے۔ یہ خوشبو ان کے وجود کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور یہی نہیں کہ انہیں سرشار کر رہی ہے بلکہ اس میں غضب کی درخشانی بھی ہے اور اس نوری آبشار میں ان

کا سارا وجود غسل کر رہا ہے جو نقوش فن پیکر اختیار کر رہے ہیں ان میں اسی روشنی کا انعکاس و انکشاف ہے۔اس طرح رومانیت کا دامن وسیع ہو جاتا ہے۔اس میں ساری کائنات سمٹ کر آجاتی ہے کیونکہ ایک خاص نظریے کے تحت پوری کائنات مادہ جاتی نظام سے وجود میں آئی ہے اور ان تمام مادوں میں مٹی عظیم اور لائق احترام ہے اور خاص طور پر بنی نوع آدم کیلئے یہ مٹی اور اس کی خوشبو زنجیر پا بنی ہوئی ہے کیونکہ اس میں چنگاریوں کی ایک فصل اگی ہوئی ہے اور چنگاریوں کی اس فصل سے ہی اس کے آتش کدے روشن ہیں وہ شراب آتشیں ہے جو انسانی وجود کے رگ و پے میں رواں دواں ہے اور پھر یہ سرمایہ جب ایک تخلیق کار اور فنکار کو حاصل ہو جاتا ہے تو اس کا تمام تر وجود اسی حصار میں سانس لیتا ہے، اسکی شاخ فکر میں رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں وہ پھول جو خاکِ لازوال کا ثمر شیریں ہوتے ہیں۔آیئے کچھ مثالیں دیکھتے ہیں:

رت بہاروں کی ہو یا چاندنی راتوں کا سماں
جز ترے دل کا جہاں کچھ بھی ہو آباد نہیں

ہیں عکس مہر و ماہ کہ تنویر کہکشاں
تیری ہی اک مثال ہے اب مسکرا ذرا

مرا سایہ رقابت میں بڑھا مجھ سے قدم آگے
کبھی قسمت کے کوچے میں اگر زہرہ جمال آیا

انور شیخ نے ان اشعار میں جمال فطرت کے حوالے سے ہی بات کی ہے یعنی ان کے جذبوں کی آگ کو اگر کوئی پہچانتا ہے تو بس نگار فطرت، یہی اس آگ کی مزاج شناس ہے لیکن محبوب کی جدائی میں کوئی شئے خوبصورت نہیں، تمام کائنات آباد ہے، شاداں ہے، رقصاں ہے لیکن ''جو تو نہیں تو ہر اک شئے میں کچھ کمی سی ہے''، شعر اول میں یہی کیفیت ہے، کولرج کہتا ہے کہ یہ کائنات نہ خوبصورت ہے نہ بدصورت، سب کچھ ہمارے ذہن کی کیفیت سے وابستہ

ہے۔ ہمارے اردو شاعری میں اس کی مثالیں کم ہیں لیکن میں یہاں دو مثالیں پیش کرتا ہوں:

دیکھا ہے میں نے دامن شام فراق میں
وہ ایک چاند دیدۂ پرنم کہیں جسے

(کوثر جائسی)

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

(فراق)

انور شیخ کی رومانیت میں اس کیفیت کو بڑا دخل ہے یعنی لمحات ہجر میں تمام کائنات انہیں خالی خالی نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دوسرے شعر میں انہوں نے عکس مہر و ماہ اور تنویر کہکشاں کو محبوب کے تبسم سے وابستہ کیا ہے گویا یہ کہہ رہے ہوں کہ اگر تو مسکرا دے تبھی تنویر کہکشاں اور عکس مہر و ماہ کے خدوخال بھی واضح ہونگے اگر تیرے لب پر تبسم نہیں ہے تو پھر کہیں کچھ نہیں ہے، فضا ویران ہے، نہ پھول ہے نہ نغمہ، نہ رنگ ہے نہ خوشبو گویا اپنے تبسم سے تو تمام کائنات کو زندہ و تابندہ کر دیتی ہے۔ ان مثالوں میں شامل تیسرا شعر تو صاف داغ کے رنگ میں ہے اور رشک کا ایک بے مثال مضمون باندھا گیا ہے کہ اس زہرہ جمال کی طرف مجھ سے پہلے میرے سائے نے لپکنے کی کوشش کی گویا وہ میرا رقیب تھا۔ اس کی مثال اردو شاعری میں کہیں نہیں ہے کہ سایہ بھی رقیب بن جائے۔ یہ شعر انور شیخ کے ندرت بیان اور صناعی فکر کی بہترین مثال ہے۔ خاص طور پر زہرہ جمال کی ترکیب اہمیت کی حامل ہے کیونکہ زہرہ بنات النعش گردوں میں سب سے روشن ستارہ ہے اور یونانی ضمیات کے مطابق زہرہ بیحد حسین و جمیل، بے حد عشوہ طراز عشق و محبت کی دیوی ہے۔ میں ان کی غزل کی رومانیت کے حوالے سے کچھ شعر اور بھی پیش کروں گا جن میں محبوب ارضی ہے مگر اس پر تمام کائنات نثار اور نچھاور ہوئی چلی جاتی ہے:

کچھ اندھیروں میں پوشیدہ سرور زندگانی ہے
متاع مہر سے شبنم کو ہر لحظہ ملال آیا

اس شعر میں فلسفیانہ پیچیدگی ہے۔ زندگی کے لمحۂ فنا کا نہایت خوبصورت پہلو بھی ہے۔ ایک طرح کی محزونی اور آزردگی بھی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ سرور زندگانی عدم میں ہی پوشیدہ ہے جس کی مثال شبنم وشعاع مہر کے رشتے میں موجود ہے۔ پنڈت برج نرائن چکبست کا کہنا ہے:

مقدر دیکھئے شبنم کا پھولوں میں ہوئی پیدا
پیام آیا فنا کا جلوۂ نور سحر ہوکر

(چکبست)

لیکن اگر رومانیت کے حوالے سے دیکھیں تو ایک دوسرے میں جذب ہوجانے اور فنا کی آغوش میں جاکر ہی بقائے دوام حاصل کرنے کی بات نکلتی ہے تو شبنم اور خورشید کے حوالے سے غالبؔ کے اس شعر پر نظر جاتی ہے:

اختلاط شبنم وخورشید تاباں دیدہ ام
جرأتے باید کہ عرض شوق دیدارش کنم

(غالب)

انور شیخ نے شبنم کے ملال کی بات ضرور کی ہے مگر اس ملال میں سرور زندگانی کی ایک جاوداں کیفیت پنہاں ہے جسے کسی طرح بھی اس منظر نامے سے منہا نہیں کیا جاسکتا، فرماتے ہیں:

کہیں بہتر حیات جاوداں سے
کسی مہوش کی اک بزم شبانہ

ذکر گل ہو شفق کی شیرینی
تیرے ہونٹوں کی بات ہوتی ہو

دونوں شعروں میں جمال فطرت کے حوالے سے خبری انداز میں بات کی گئی ہے حیات جاوداں اور بزم شبانہ کی رعایتوں نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچادیا ہے۔ گل، شفق،

شیرینی، ہونٹ تینوں میں ہی حد درجہ مماثلت ہے یہی وجہ ہے کہ انور شیخ کی غزل میں جذبے کی آگ اس قدر لذت انگیز ہے کہ اس میں تہہ در تہہ اترتے جایئے اور ان کے عاشق دل کو تلاش کرتے جایئے یعنی دل عاشق کو جو اس آگ میں مسکن گزیں ہے یعنی شعلہ پروانے کا مسکن ہے۔ کچھ اور تصویریں دیکھئے:

صنم اب بھی ٹپکتی ہے ترے چہرے کی جھریوں سے
شباب شوخ کی گرمی، جگر سوزی و رعنائی

اس شعر میں عشق و رومان کی اس جاوداں کیفیت کا بیان کیا گیا ہے جو صرف ایک سچے عاشق کے دل پر گزرتی ہے اور وہی اس کی لذت کا احساس کر سکتا ہے۔ یہاں دل ایک نگار خانہ ہے جہاں لمحوں کی تصویریں پناہ گیر ہوتی ہیں، جب بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس نگار خانے کی تصویروں پر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹا کر اصنام کے چہروں کی زیارت کر لی جاتی ہے، وقت کہیں پہونچ جائے، زمانہ خواہ کچھ بھی ہو، زندگی کتنی ہی کروٹیں بدلے لیکن دل عاشق نہیں بدلتا، آئینہ خانے کی ہر تصویر جاوداں ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ رواں لمحوں میں چہرے کی جھریوں کے عقب میں شباب شوخ کی گرمی، جگر سوزی اور رعنائی نظر آتی ہے یعنی عاشق کی نگاہ میں وہ عارض بھی ہیں جو کبھی گلاب کی طرح دہکتے تھے، وہ آواز بھی ہے جو کبھی شعلے کی طرح لپکتی تھی، وہ زلفیں بھی ہیں جن کے گھنے بادل پوری کائنات عشق پر محیط ہوتے تھے حالانکہ آج عارض برگ زرد خشک میں تبدیل ہو چکے ہیں، گھنے گیسو تار عنکبوت بن چکے ہیں مگر عاشق کے دل میں وہی تصویریں جاگ رہی ہیں، تازگی اور شادابی چاروں طرف جلوہ ریز ہے۔ یاس یگانہ چنگیزی نے کیا خوب کہا ہے:

کوئی میری آنکھ سے دیکھتا یہ زوال دولت رنگ و بو
کہ بہار حسن کی شام کو بھی عجیب جلوہ گری رہی

(یگانہ)

لیکن سب سے پہلے یہ گراں قدر خیال منشی امیر مینائی کے یہاں اس انداز سے جلوہ گر ہوا ہے جس کی کیفیت اور لذت دیکھتے ہی بنتی ہے:

عالم عجب ہے سن سے اتر کر بھی یار کا
جوبن فضا میں ڈوب گیا ہے بہار کا

(امیر مینائی)

انور شیخ نے شباب اور دوشیزگی کے انہیں لمحات کو قید کیا ہے اور جب چاہتے ہیں انہیں لمحوں کے توسط سے اس حسن کو دیکھ لیتے ہیں جو نہ ہونے کے باوجود بھی موجود ہے، زندہ ہے، تابندہ ہے اور عاشق کے بساط دل پر ایک نقش جاوداں، ایک غنچہ نو دمیدہ کی طرح دمک رہا ہے۔ انور شیخ نے اپنے ان دو اشعار میں بھی حسن کے حوالے سے عجیب کیفیات کو پیش کیا ہے:

اس شوخ نے بنا دیا حیرت کدہ مجھے
انور تھی آرزو، کرے حیراں کبھی کبھی

کسی کی کمسنی کیونکر پریشانی کا باعث ہے
کہ آخر گل میں آتا ہے جمال آہستہ آہستہ

شعر اول میں وہ لمحہ نمودار ہوا ہے جو بیحد سحر انگیز ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جہاں انسان پتھر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نقش دیوار بن جاتا ہے یعنی یہ حیرت کی انتہا ہوتی ہے۔ صرف تنہائی ہوتی ہے ایک بے کراں تنہائی، حیرت کدے کی ہر شئے نقش حیرت ہوتی ہے۔ ایک سحر ہوتا ہے جو انسان کو تمام فکر و ہوش سے ماوراء کر دیتا ہے۔ شاید اسی مقام پر بیدل نے کہا تھا:

ہر طرف سفر کردیم ہم بخود سفر کردیم
اے محیط حیرانی ایں چہ بیکرانی ہاست

انور شیخ نے تمنا ظاہر کی ہے کہ کبھی کبھی حیرانی ہوتی تو پھر کیا لطف ہوتا لیکن مسلسل حیرتی ہونا حیرت کدہ میں مسلسل ایک نقش سنگ کی طرح پڑے رہنا کیسا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اس حیرت کدہ سے آزادی نصیب ہوتی ہی نہیں۔ شاعر اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہے اسی لئے وہ کبھی کبھی حیرت میں اسیر ہونا چاہتا ہے مسلسل حیرتی نہیں بننا چاہتا کہ اس عالم میں پہونچ کر اس کی یہ مالت ہو جائے کہ اسے حیرتی بنانے والا تو چلا جائے مگر وہ جس تس کا